BANGALORE UNIVERSITY

Course Title BA (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy(SEP)

2024-25 and onwards

First Semester

Course Content: Afsane, Nazmein, Grammar, Drama

Course Credits - 3

Total Contact Hours 4/week

Summative Assessment Marks = 80

Formative Assessment Marks = 20

UNIT :1

افسانے

۱) سمجھوتا	کرشن چندر
۲) دوسری حکومت	عبدالصمد
۳) آدمی	سید محمد اشرف
۴) جیون گیان	صبیحہ انور

UNIT : 2

نظمیں

۱) زندگی	علامہ اقبالؔ
۲) مجھے گھر یاد آتا ہے	میراؔجی
۳) روٹیاں	نظیرؔ اکبرآبادی
۴) مجبوریاں	اسرارالحق مجازؔ

UNIT : 3

گرامر

UNIT : 4

ڈرامہ

شطرنج کے مہرے	حبیب تنویر

کرشن چندر

سمجھوتا

واسنت مراٹھے کی شادی، شاردا ڈیسائی سے ہوتی ہے۔ شاردا گجراتن ہے۔ اور واسنت مراٹھا۔ یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چمبور میں لال ٹین بنانے کا کارخانہ نہ ہوتا۔ اس کے کارخانے کے قریب، شاردا کا باپ مگن لال ڈیسائی، اپنا کانچ کا کارخانہ کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لال ٹین بنانے کا سارا سامان تیار ہوتا تھا۔ سوائے کانچ کے ہنڈے کے اور یہ ہنڈہ ڈیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا۔ اس لیے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لال ٹین مکمل ہوگئی!

واسنت، میانے قد کا کٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا اور دور سے بالکل اپنے کارخانے کی لال ٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا تھا۔ شاردا گورے رنگ کی، لانبے قد کی۔ بڑی، بڑی آنکھوں والی نازک بدن، کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی، کیونکہ ہندوستان میں شادی پہلے ہوتی ہے، محبت بعد میں ہوتی ہے۔

واسنت اور شاردا کے دو بچے تھے۔ لکشمن اور کملا۔ لکشمن چھ سال کا تھا، کملا چار سال کی تھی، دونوں میاں بیوی بڑے مزے میں اپنے بچوں کے ساتھ، چار بیڈ

روم والے فلیٹ میں رہتے تھے۔جس کا نام لال ٹین نواس تھا۔ یہ فلیٹ مگن لال ڈیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔

جس دن لکشمن پیدا ہوا۔ اس دن اس کے دادا رام مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لال ٹینوں کے ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانہ بھی چالو کر دیا تھا۔ پھر جس دن شاردا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی، اس دن لڑکی کے نانا نے کانچ کے برتنوں کے ساتھ ساتھ تھرمامیٹر بنانے کا کارخانہ بھی شروع کر دیا۔اور مگن لال ڈیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا بیرومیٹر، واسنت اور شاردا کے گھر میں لگا دیا تا کہ دونوں میاں بیوی کو لڑائی کے سمے ایک دوسرے کے ٹمپریچر کا اندازہ ہوتا رہے۔!

شادی شدہ زندگی کے سات سال بڑے مزے میں کٹ گئے۔ پھر جس دن رنگا ریڈی نے مایوں بنانے کا کارخانہ سائین میں چالو کیا۔اور سردار چانن سنگھ نے دادر میں دی گریٹ مون شائن فلم کمپنی کا مہورت کیا، اس دن بمبئ میں ایک طوفان اُٹھا، ہنگامہ ہوا۔ گولی چلی، ٹراموں پر پتھراؤ ہوا۔سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھیں غصے سے لال ہوگئیں اور اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پر پٹخ دیا اور بولا۔ چھ۔؟ (ہیں۔)

''سوں مجھے۔(کیا ہے۔؟) شاردا بولی

واسنت نے کہا۔ یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئ تمہاری ہے۔ بے شک تمہاری

ہے، لیکن وہ ہماری بھی تو ہے۔ ہم گجراتیوں کی ''وہ بمبئی تمہاری کیسے ہوگی؟ بمبئی تو مراٹھوں کی ہے۔

''نہیں وہ گجراتیوں کی ہے!'' شاردا غصے سے بولی

''یہ سارا شہر ہم نے بنایا ہے، اس کا بزنس ہم نے چلایا ہے، اس کا کارخانہ ہم نے لگایا ہے۔ تم کدھر سے حق جتانے لگے۔ ہماری بمبئی پر۔؟''

''شہر تم نے بنایا ہے۔؟'' لیکن اس شہر کو بڑھایا کس نے ہے۔؟'' بزنس ضرور تم نے چلایا ہے، لیکن اس بزنس کو پھیلایا کس نے ہے؟ کارخانہ تم نے لگایا ہے، لیکن کارخانے میں کام کون کرتا ہے؟ ہمارے مہاراشٹرا کا مزدور! سمجھیں۔؟ بمبئی آمچی ہے! (بمبئی ہماری ہے)

واسنت نے آملیٹ کو چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''نا بمبئی اماری چھے'' (بمبئی ہماری ہے) شاردا ویجٹیبل کٹلس پر نمک چھڑک کر بولی۔

''اگر لی کھوٹا ہوتا'' (آپ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں)

''تمے جے کہو چھے تے جھٹھو چھے۔ دندن جھوٹھو چھے (تم نے جو کہا وہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ) بمبئی آمچی آہے'' (بمبئی ہماری ہے)

''نا بمبئی اماری چھے'' (نہیں ہماری ہے) واسنت نے چائے کا چمچہ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری، کانٹے پلیٹ میں پھینک دیئے۔ دونوں ناشتے

کی میز سے اٹھ کر اپنے کمروں میں جا کر بند ہو گئے۔ بچے سہم کر سسکنے لگے۔

جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال ڈیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بڈھے، نوجوان میاں بیوی کی حماقت پر بڑے ہنسے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا۔

''مگن بھائی۔ ہمارے بچے کس قدر بھولے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مہاراشٹرا بن جائے۔ چاہے گجرات الگ ہو جائے، مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت رہے گی اور مراٹھوں کو گجراتیوں کی۔!

ہاں، جیسے تمہاری لال ٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمہاری لال ٹین کی۔!

''بالکل'' رام مراٹھے نے نظر ملا کر کہا۔

''تو چلو چل کر ان دونوں بے وقوفوں کو سمجھائیں۔! مگن لال نے تجویز پیش کی اور دونوں بزرگ اسی وقت اٹھے اور موٹر میں بیٹھ کر ''لال ٹین نواس'' پہنچے اور وہاں جا کر واسنت اور شادار کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔ واسنت کے باپ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا ''شرم نہیں آئی میری بہو کو تنگ کرتا ہے۔''

مگن بھائی نے شاردا سے کہا ''نالایق اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے۔''

''میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتا جی'' شاردا سسکتے ہوئے بولی۔

''یہی جھگڑا کرتے ہیں۔ بولتے ہیں، تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ہم مراٹھوں سے جھگڑا کرتے ہو اور ہمارا حق مارتے ہو۔''

''ایسا۔؟ مگن لال ڈیسائی چوکنا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔ واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا" پتا جی یہ بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں۔''

''ایسا۔؟'' رام مراٹھے نے گھور کر شاردا کی طرف دیکھا اور گرج کر پوچھا ''کیا تم نے ایسا کہا تھا؟'' اور یہ کہتے کہتے رام مراٹھے غصے سے کھڑا ہو گیا۔

پیش تر اس کے کہ شاردا کوئی جواب دیتی۔ اس کے باپ نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ اور خود دار مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا'' اگر میری بیٹی نے کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

رام مراٹھے دانت پیس کر آگے بڑھا۔ اور بولا" اگر تمہاری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے نے بھی جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے!"

''بمبئی اماری چھے" مگن لال ڈیسائی نے چلا کر کہا اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے بولا" چل بیٹی اپنے گھر چل۔ ہم کوئی گرے پڑے نہیں ہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں۔"

''جاتے ہو تو جاؤ'' رام مراٹھے اپنی چھڑی ہوا میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''مگر کہے دیتا ہوں۔ دوبارہ اس گھر میں گھسے تو ٹانگ توڑ دوں گا۔

''بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے۔ جیسے بمبئی تمہارے باپ کی ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ بمبئی میرے باپ کی ہے۔ بلکہ میرے باپ کے باپ کی ہے۔''

واسنت کا باپ گرج کر بولا۔

''جے مہاراشٹرا''

''جے گجرات" مکن لال ڈیسائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اپنی بیٹی اور بچوں کو لے کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

آج واسنت کے گھر میں اندھیرا تھا۔ شاردا کو گھر چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال سے نہ واسنت نے شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ اپنے بچوں کی۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے اندولن چلے۔ آپس میں لڑائی، جھگڑے ہوئے۔ مگر آخر میں سمجھوتا ہو گیا۔ بمبئی کا صوبہ تقسیم ہو گیا۔ گجرات کا صوبہ الگ بن گیا۔ مہاراشٹر کا صوبہ الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ میں بل پاس ہوا۔ ہر چیز طے ہو گئی۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالی گئیں اور آج ۲۹ اپریل تھی۔ روشنیوں کا دن منایا گیا۔ گانے، ناچ، جلسے، جلوس، ہنگامے، غل غپاڑے، تماشے، مشاعرے، کوی سمیلن، تقریریں، نعرے، ڈھول، تماشے، باجے گاجے، لوگوں نے آج سارے بمبئی میں روشنی کی تھی اور اسے دلہن کی طرح سجایا تھا۔ مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں آج اندھیرا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دورویہ درختوں پر بھی بجلی کے ہزاروں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ہواؤں میں خوشبو تھی، فضاؤں میں قہقہے تھے۔ عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے، جوڑے میں پھولوں کی دینی سجائے بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنے بیوی، بچوں کی یاد سے بے چین ہو اٹھتا تھا۔ کئی بار اس سے پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی سے صلح کر کے اس کو بچوں سمیت واپس بلا لائے۔ مگر ہر بار، ایک جھوٹی عزت، اس کا دامن پکڑ لیتی تھی اور وہ رک جاتا تھا۔

آج اسے نہ صرف شاردا بلکہ اپنے پیارے بچے بھی کتنے یاد آ رہے تھے۔ ننھا لکشمن اور بھولی کملا۔ ان دونوں معصوم بچوں کی صورتیں گویا اس کے دل کے دامن کو پکڑنے لگیں، اور وہ سوچنے لگا بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا، خواہ مخواہ اپنا گھر برباد کیا۔ بھلا کیوں؟

بمبئی کے مہاراشٹر میں آ جانے سے کیا اس کی صورت بدل گئی؟ کیا اس کا میرین ڈرائیو اٹھ کر پونا چلا گیا۔ کیا فورڈ کا علاقہ ناگپاڑے میں آباد کر دیا گیا ہے؟۔ کیا آج بھی لوگ سڑکوں پر نہیں سوتے؟ غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے۔ دکھ اور درد کا درمان نہیں ڈھونڈتے؟ مفلسی اور موت کا سامان نہیں کرتے۔؟ پھر کس لیے اس نے اس قدر جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کیا اور اپنے بچوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔

آج ہر گھر میں روشنی ہے۔ صرف اس کے گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے اور اس کے دل میں اتنی ہمت باقی نہیں ہے کہ اپنے اندھیرے کونے سے اٹھ کر ایک بتی بھی روشن کر دے۔ وہ دیر تک اسی طرح جلتا، کڑھتا اور سوچتا رہا اور ایک اندھیرے

کونے میں، آرام کرسی پر آنکھیں بند کیئے، ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا۔ اور اس کے چاروں طرف خوشیوں کا جلوس گزرتا رہا۔ دوتین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ مگر وہ آج کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔ جو بھی ہوگا تو خود ہی اندر آ جائے گا۔

پھر یکا یک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔

''ارے آج خوشیوں کے روز یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے۔؟'' اس آواز کے ساتھ ہی ایک بتی جلی۔ اور اس بتی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے پر شاردا بچوں کی انگلی پکڑے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے چونک کر شاردہ کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر وہ یکلخت اپنی کرسی سے اٹھا اور دوڑ کر دروازے کی طرف گیا۔ جھپٹ کر اس نے جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیا۔ اور ان کو پیار کرنے لگا۔ شاردا نے یکا یک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جا کر بولی " شرم نہیں آتی ہے لوگوں کو، مہاراشٹر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا ہے۔''

واسنت کچھ نہ بولا۔ مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیے قطار اندر قطار مسکرانے لگے۔ پھر وہ دھیرے سے اپنی بیوی کے قریب گیا اور سر جھکا کر بولا۔

" شاردا مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آ گئی ہو؟

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا کیوں نہ آتی؟ کیا یہ میرا

گھر نہیں ہے۔؟ کیا یہ بمبئ شہر میرا نہیں ہے۔؟" شاردا نے بے خوف نگاہوں سے واسنت کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’بمبئ آمچی ہے‘‘ (بمبئ ہماری ہے)

واسنت نے مسکرا کر کہا’’ تمہاری چھے۔ ترن تمہاری چھے‘‘ نہ صرف بمبئ تمہاری ہے۔ یہ گھر بھی تیرا ہے اور میں خود بھی تیرا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوالو؟‘‘

شاردا کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا! اس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی’’ میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی، میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے نہ میرا۔ یہ سارا دیس ہمارا ہے اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندھی، بنگالی اور ملیالی، ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں، ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ گو صوبے الگ ہیں، مگر ملک ایک ہے۔ گو کمرے الگ الگ ہیں، مگر گھر ایک ہے۔ میں گجراتی ہوں، تم مراٹھے ہو۔ مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک۔!‘‘

واسنت نے مسکرا کر شاردا کو گلے لگا لیا۔ اور پھر بچوں کو لے کر باہر بالکونی میں آ گیا۔ جہاں ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

عبدالصمد

دوسری حکومت

دفتر پہنچتے ہی جب اخبار میں، میں نے یہ پڑھا کہ سرکار نے اشیائے ضروری کے دام طے کر دئے ہیں اور اب چور بازاری یا مہنگائی کی کوئی گنجائش یا شکایت نہ رہے گی، تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسی کام میں بھی جی نہیں لگنے لگا۔ جلد سے جلد بازار پہنچ کر اپنے خوابوں کی حسین تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتا تھا اور پھر گھر پہنچ کر بیوی کو خوابوں کی اُن حسین وادیوں میں لے جاتا جس کے لیے ایک عرصہ سے میں کوشاں تھا اور جس کے لیے جنم جنم سے وہ ترس رہی تھی۔

لیکن دیکھ کر مجھے سخت حیرت اور افسوس ہوا کہ یہ خبریں پڑھ کر صرف میں ہی خوش تھا۔ دفتر میں لوگوں نے ان خبروں کو اس طرح پڑھا تھا جیسے انھوں نے محض یہ پڑھ لیا ہو کہ رات چلتی پھرتی سڑکوں پر کتنوں کو لُوٹ لیا گیا اور کتنوں کو زخمی کیا گیا وغیرہ وغیرہ............شاید یہ خبریں بھی لوگ اس لیے پڑھتے تھے کہ شاید اُن میں کسی جان پہچان والے کا نام نکل آئے اور اگر اتفاقاً کسی کا نام شائع ہو ہی گیا ہو تو پھر دیکھئے ان کی خوشی۔

اپنے آپ کو یہ سمجھ کر کہ شاید ان لوگوں کی نظریں ان خبروں پر نہیں پڑی

ہیں ورنہ اپنے آپ سے ایسی بے تعلقی کیسے ہوسکتی ہے۔ میں نے لال روشنائی سے ان خبروں کو گھیر دیا۔ اور پھر خود ہی اخبار لے کر سارے دفتر میں گھوم گیا اور تب یہ ہوا کہ میری حیرت اور افسوس میں صرف اضافہ ہی ہوا۔ کچھ لوگوں نے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں اور اپنے ہوش وحواس کھو کر ان کے پاس آیا ہوں ۔ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں تمسخر تھا، کچھ لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے افسوس اور ترس کے جذبات تھے اور کچھ نے اسے میری عادت سمجھ کر ایک کان سے سنا، دوسرے سے اُڑا دیا............

جی ہاں ......عادت، جس کی وجہ سے دوستوں میں نکّو بنتا ہوں، اپنے پرائے میں رُسوا ہوں ۔ لوگ مجھے دیکھ کر کترانے لگتے ہیں، سیدھی طرف آرہے ہوں تو ادھر اُدھر راستہ ڈھونڈتے ہیں، اِدھر اُدھر چل رہے ہوں تو سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اگر اتفاق سے کوئی راستہ نہ ملا، کوئی چارۂ کار نہ رہا تو اپنی ذات میں مصروف ومگن ہو کر اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ میں مسکراتا ہوا اُنہیں دیکھتا رہتا ہوں، اور کر بھی کیا سکتا ہوں، اپنی عادت تو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اُنہیں اُن کے حال پر توجہ دلانا چاہتا ہوں لیکن اُن کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ وہ بس روٹی کمانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ اُنہیں اس کا بھی ہوش نہیں کہ ان کو اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ بھی مل رہا ہے یا نہیں۔ بس بے زبان بھیڑوں کی طرح ہنکے جا رہے ہیں، دائیں ہانک دیا گیا تو دائیں، اور بائیں ہانک

دیا گیا تو بائیں ....ان لوگوں کو یہ سوچنے کی اک ذرا فرصت نہیں کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا، ویسا ہوا تو کیوں ہوا۔ وہ ہواؤں سے اپنی سانس لیتے ہیں لیکن انہیں ہَوا کے رخ کا بھی پتہ نہیں، ایسی لاعلمی، ایسی لاتعلقی ......اُنہیں دھیان دلانے کی کوشش کرو کہ چونکہ تم ہواؤں سے سانس لیتے ہو اس لیے ہواؤں کا رخ بھی جانو۔ تم بے زبان بھیڑ نہیں ہو کہ جدھر چاہے ہانک دیے جاؤ، تم تمام فیصلوں اور اقدام کے برابر کے حقدار اور شریک ہو، تو الٹا میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اس حکومت کو اپنی حکومت نہیں سمجھتے جسے انھوں نے اپنی رائے استعمال کر کے اپنے اُوپر لاگو کیا ہے، وہ تو اپنے آپ کو اُس حکومت کی رعایا سمجھتے ہیں جو بازاروں میں قائم و دائم ہے، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی، لیکن جس کے وجود پر لوگوں نے مکمل ایمان لایا ہوا ہے، نظر آنے والی حکومت کو تو وہ ایک DECORATION PIECE سمجھتے ہیں............

ایک بچاری بیوی ہی ہے جس سے جی بھر کے دنیا کے مسائل پر گفتگو کرتا ہوں، قومی اور بین الاقوامی حالات پر غوض وخوض............اور وہ میری خاطر ہی سہی، تمام خبروں اور مسئلوں میں پوری دل چسپی لیتی ہے اور اپنی بساط بھر تمام معاملوں میں اپنی ایک رائے رکھتی ہے۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی دفتر کو نپٹایا اور بازار کو ہوتا ہوا گھر کو چلا۔ بازار حسب معمول تھا۔ کہیں پر بھی کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے معلوم ہو کہ آج صبح اخبار شائع ہوا ہے اور لوگوں

میں تقسیم بھی ہوا ہے، لیکن لوگوں کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے تعجب نہ کر کے چُپ رہا۔ جیب میں کچھ پیسے تھے، کچھ ایسی چیزوں کے دام، جن کے نام اخبار میں شائع ہوئے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاید دوکاندار نے اخبار کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ میں نے اُس کی لاعلمی پر افسوس کرتے ہوئے اُسے اطلاع دی کہ سرکار نے چیزوں کے دام طے کر دیئے ہیں اور وہ جو قیمت بتا رہا ہے وہ غلط ہے۔ اُس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، جواب یہ دیا کہ اُسے اخباروں میں چھپی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ جس کو ضرورت ہوگی وہ اُسے اسی دام میں لے جائے گا۔ اب میں اس سے کیا کرتا لیکن شاید تمام دوکانداروں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جو ایک بولے گا، وہ سب بولیں گے۔ تھک ہار کر میں نے گھر کی راہ لی کہ کم از کم بیوی کو تو یہ خوش خبری سنا دوں، کیونکہ یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا تھا بیچاری سرکار کو اس کی خبر نہیں کہ بازاروں میں کیا ہو رہا ہے ورنہ............لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منا سکتی ہے۔ گھر پہنچا اس سے پہلے بیوی سے محبت بھری باتیں کیں، اپنی محبت اور وفا کا اسے یقین دلایا، اس کے عشق میں آگ کے دریا میں ڈوب جانے کی بات کی، اس کی گھنیری زلفوں، سیب جیسے گال، شہد بھرے ہونٹ، صراحی دار گردن اور سرو قد کی تعریف کی۔ اُس نے میری تمام باتوں کا صدق دل سے اس طرح یقین کیا جیسے میری باتیں اُس پر وحی بن کر اُتری ہوں۔ پھر میں نے اُسے وہ مژدہ سنایا............

بیوی کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ جس نے میرے اندر اندر آگ لگا دی۔ اُس کی یہ بے یقینی مجھے توڑ کر رکھ دیتی اگر میں اپنے آپ کو فوراً سنبھال نہیں لیتا .... ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، ہر کسی کے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ ہوا میں گھمایا اور مقصد حاضر، اور نہ ہر کسی کے پاس علاء الدین کا چراغ ہوتا ہے کہ دیو ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے دل ہی دل میں بیوی کی معصومیت پر افسوس اور اس کی عقل پر ترس کھا کے سوچا کہ اب کچھ بولنا لا حاصل ہے، جب میری باتیں سچ ثابت ہوں گی تو پھر خود ہی ان لوگوں کو عقل آئے گی، بھلا اخبار میں چھپی باتیں غلط کیسے ہو سکتی ہیں اور سرکار جھوٹ کیسے بول سکتی ہے۔

اخباروں میں یہ خبریں صرف ایک دن چھپ کر نہیں رہ گئیں بلکہ کئی روز تک اس قسم کی باتیں شائع ہوتی رہیں اور ان پر خوب گرما گرم بحث رہی۔ لوگوں کی بے تعلقی برقرار تھی کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو دوسری حکومت کی رعایا تسلیم کئے بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ خبریں اور بحثیں مسرت کا باعث تھیں کہ ان سے میری اس حکومت پر اعتماد اور یقین پختہ ہو رہے تھے جسے میں تسلیم کرتا تھا میں دل ہیں دل میں لوگوں کی بے حسی اور بے وقوفی پر ماتم کرتا اور مجھے ہنسی بھی آتی کہ جب میرا یقین سچ ثابت ہوگا تو ان پر کیا گزرے گی۔ میں جب بھی بازار جاتا تو بیوی کے کانوں میں یہ بات ضرور ڈال کر جاتا کہ آج جب میں لوٹوں گا تو وہ میری جیب کا کرشمہ دیکھے گی جسے اُس نے اب تک ہلکی ہی ہوتی دیکھی ہے لیکن پتہ نہیں سرکار کو

اس کی وہ مسکراہٹ پسند تھی یا بازار والوں کو میری ضد تھی کہ ہزار کج بحثی، ہزار سمجھانے بجھانے، ہزار یقین دلانے اور ہزار کوشش کرنے پر بھی جیب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور بیوی کی وہ مسکراہٹ برقرار رہی تو میں نے تھک ہار کر امید ہی چھوڑ دی اور دل کو سمجھا لیا کہ شاید کوئی مصلحت ہو گی یا پھر کوئی ایسی بات ہو گی جسے ظاہر کرنا عوامی مفاد میں نہیں ہو گا۔ لیکن یہ میں نے طے کر لیا تھا کہ حکومت میں ایسی سرکار کو تسلیم کروں گا جسے میں نے اپنی رائے سے اپنے اوپر لاگو کیا تھا، اُس سرکار کی ہرگز نہیں جسے کسی نے اپنی رائے نہیں دی تھی لیکن پھر بھی جس کی حکومت قائم تھی اور جس کی طاقت میں روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

اُس دن میں نے نکڑ کے حلوائی کی دوکان پر وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر سنی، پوری قومی معیشت کا نقشہ سامنے تھا قیمتوں کی لگامیں کہیں سے کس دی گئی تھیں، کہیں سے ڈھیلی کر دی گئی تھیں۔ دوکان پر بھیڑ تو تھی اور لوگ بجٹ سن بھی رہے تھے لیکن اس طرح پر جیسے صبح کا اخبار پڑھتے ہیں کیونکہ بے یقینی کے زہر نے کسی میں بھی جان باقی نہیں رکھی تھی۔

میں جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا گھر کی طرف چلا کہ بیوی کو بجٹ کی خبر سُنا دوں اور پھر دیکھوں کہ ہماری پلیٹوں میں کیا اضافہ ہونے جا رہا ہے اور کیا کمی .... گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ بیوی کے حواس باختہ چہرے پر نظر پڑی حالانکہ اُس وقت اس کے تازہ دم اور خوبصورت نظر آنے کی کوشش کرنے کا وقت

تھا۔میں نے بھی نظر انداز کر کے اُسے مخاطب کیا۔

''ارے سنو......نیا بجٹ......''

وہ بات کاٹتی ہوئی بولی۔

"چھوڑو بھی......مُنّا کی طبیعت صبح سے بہت خراب ہے،کئی الٹیاں ہو چکی ہیں، اِس وقت ایک سو دو ڈگری بخار ہے، اول فول بک رہا ہے، بے ہوشی کی کیفیت ہے''۔

یہ سنتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔میرے اور بیوی کے درمیان کی مضبوط کڑی میں ایک مُنّا تھا۔ہماری آنکھوں کا تارا......ہمارے سکون و اطمینان کا گہوارہ......میں نے جلدی سے مُنّا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جیسے میرا کلیجہ جل اُٹھا۔مُنّا بخار میں پُھنک رہا تھا۔میں سرپٹ ڈاکٹر کے ہاں بھاگا۔اس کے ہاں مریضوں کی بھیڑ تھی ، میں نے ڈاکٹر کے پیر پکڑ لئے اور جب ڈاکٹر کو لے کر میں گھر پہنچا تو بیوی کی آنکھوں میں امید کے دیے بجھ چکے تھے اور مُنّا ، یا تو سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ڈاکٹر نے ہر طرح کی جانچ کے بعد خبر دی:

''یہ تو ملاوٹ کا کیس ہے!''

''لیکن ڈاکٹر......ہمارے ہاں تو اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ملاوٹی چیزیں استعمال نہ ہوں۔''

''یہ آپ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔آجکل تو ہَوا بھی خالص نہیں

ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا میرا تمسخر اُڑایا۔ اُس نے ایک انجکشن لگایا، دو تین گولیاں لکھیں، ایک دو مکسچر لکھے اور چلا گیا۔ دواؤں نے مُنّا کی حالت اور بگاڑ دی اور اس کی آنکھوں سے زندگی جانے لگی۔ میں پھر ڈاکٹر کے پاس بھاگا۔ اب کی ڈاکٹر آیا تو سب سے پہلے اس نے دواؤں کو دیکھا اور بولا:

ارے صاحب...... یہ تو نقلی دوائیں ہیں...... یہ تو زہر ہیں زہر......انہیں پھینک دیجئے اور اب میں اپنے پاس سے دوائیں دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر کی دواؤں نے فائدہ کیا اور دوسری صبح مُنّا مسکرانے لگا۔ زندگی جاتے جاتے لوٹ آئی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور اب مجھے بجٹ کا خیال آیا تب تک بجٹ ہمارے گھروں میں لاگو ہو چکا تھا اور اس پر تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع بھاگ دوڑ اور پریشانیوں میں ختم ہو چکے تھے۔

بیوی نے کہا:

''اب تو مان جاؤ کہ اب تک تم غلط کہتے، سوچتے اور یقین کرتے آئے ہو'

میں نے کہا:

''کیسے مان لوں؟ دنیا اگر غلط کرتی ہے تو میں کیوں کروں؟"

اُس نے کہا:

''تم مانو یا مانو......کوئی مانے نہ مانے لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ دوسری حکومت قائم ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں اپنی آنکھوں میں بے یقینی اب بھی محسوس کر رہا تھا......۔

سید محمد اشرف

آدمی

کھڑکی کے نیچے انہیں گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑ کر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پہ ٹک کر دھیمے سے بولا۔ ''آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔''

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ ''تم نے تو دو ہی دن دیکھا ہے نا! میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے کھول دوں تو دل اور زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھر ہی آ رہے ہوں''۔

سرفراز چپ ہو گیا۔

پھر ایک لمحے کے بعد بولا۔

''آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ۔۔۔''

میں نے تمہیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا۔''

سرفراز نے چاہت بھری نظروں سے اپنے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔

دونوں کی بہت ساری یادیں ایک سی تھیں۔

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی اپنے خالو کے گھر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ خالد کا گھر ایک بڑے دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ وہیں پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر اپنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول مٹا کر ایک لیمپ نما بطخ بنا کر اس کی ربڑ واپس کر دی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام ہوا تھا۔

''سید انوار علی'' ''حاضر جناب''

سرفراز دھیرے سے بولا۔

''سید انوار علی''

''حاضر جناب۔ تمہیں اسکول یاد آرہا ہوگا۔''

''ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

''یار تم اب بھی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماساب کے علاوہ اور کون جانتا تھا؟''

سرفراز یہ سن کر مسکرایا حالاں کہ گھامڑ والا جملہ اسے برا لگا تھا لیکن وہ سوچ کر کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میرا بچپن کا یہ

دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساسِ کمتری پہ قابو پانے کے لئے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہیے۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل، سنسان باغوں اور خاموش کھیتوں میں ہو کر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کرلیں اور بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور مست چال سے بستے کندھے پہ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہا سہا، دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا۔ انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا کبھی نہیں ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیونکہ تالاب کے بعد سڑک
مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

''تم ڈرنا مت سرفراز۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا۔''

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر ظاہر نہ ہو، چہرے پہ بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا۔

''نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں''۔ یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قُل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آجاتی تھیں۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے کچی سڑک پر اکّا دکّا آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جانے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹری پہ مڑتے ہی بالکل سنّاٹا ہو جاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا یا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سنّاٹے کو اور ڈراؤنا بنا دیتی۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب وہ آیۃ الکرسی بھول جاتا تھا۔ وہ قل ہواللہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اول کلمہ طیّب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں کہرے میں لپٹا باغ جس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے

والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا۔ کیوں کہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ فجری کے درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنّات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس مینڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے منارے اور مندر کے کلس نظر آتے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا، ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آجاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جا رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر گانا شروع کر دیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں مچمچا کر اسے دیکھتا۔

''رام رام بیٹا...... پٹواری صاحب کے بھانجے ہو۔ انہیں ہماری رام رام بولنا''

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر پاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ رو پیٹ کر کالج سے نام کٹا کہ اپنے گاؤں واپس جا چکا ہوتا۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔وہ گراونڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہو گیا تھا ۔وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔نہر کی پٹری پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہوگا۔اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے سے گزرا درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت سے اتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔اسے لگا جیسے جنّات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔وہ ایک بڑا بندر تھا چلتے چلتے اچانک رُک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خُر خُر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جنات بابا کے مقابلے میں کم۔اس نے اپنا بستہ بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔آج آگے کا راستہ بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔آگے سنسان باغ جس میں اب آدمی ہونے کی اسے کوئی امید

نہیں تھی اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بڑھا۔ بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔

''آج بہت دیر کی بیٹا''۔

ارے ...... آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماسباب نے ''مائی کاؤ، لکھنے پر اسے دیری گڈ دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اس کا پھاوڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

''آدمی سلام'' وہ چہک کر بولا۔

''جیتے رہو بیٹا۔ پٹواری ساب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آ کر کھانا کھا کے دلان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ راستے میں واپسی کے لئے اسے کیسی جوکھم اٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی بال کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے الٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو خالو سے بھی چھوٹا لگتا ہے ابھی نہیں مرے گا۔

''سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اسے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔''

سرفراز کو یہ سن کر بہت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے، لیکن کھوکھلی آواز میں انوار کو بتایا کہ سرکاری ملازمت خصوصاً ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی پھر اسے عائشہ کی یاد آئی، جسے اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی اتنی بڑی ہوگئی۔

''شادی کب ہے؟''

''پرسوں بارات آئے گی۔''

’’ارے۔ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے‘‘ تم نے دیکھا نہیں، کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب لال بھبھوکا چہرے لئے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے ...‘‘

انوار اسے دیکھتا رہا۔پھر بولا۔

’’میں نے بھی خالہ سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے والا وقت نہیں ہے۔گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔خود انہیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔مگر خالہ کی بھی مجبوری ہے۔خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے جو تین دن بعد جدّہ واپس چلا جائے گا۔خالو بھی اب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔تمہیں آج ہی چلنا ہو گا سرفراز۔بھابھی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو۔‘‘

’’کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا انوار۔پرسوں ریل گاڑی سے اتار کر......‘‘

وہ چپ ہو گیا۔انوار بھی خاموش ہو گیا۔پھر بولا۔

’’اچھا تو بھابھی اور بچوں کو یہیں رہنے دو۔‘‘

ہاں۔ان لوگوں کو نہیں لے جا پاؤں گا۔‘‘

گیارہ بجے ہیں......اگر بارہ بجے بھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک خالہ کے ہاں پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’ہاں تقریباً ڈھائی تین کلومیٹر کا سفر ہے۔‘‘

راستے میں نہر کے پل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آ کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ بچاؤ کے لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سامنے پل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آ رہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ سرفرانہ نے آیۃ الکرسی یاد کی۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا اس لئے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا۔

کھلے عام سڑک پر اکّا دکّا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اکّا دکّا آدمیوں سے نپٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعہ کو جب احمد شہر کی پٹری سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے ....''

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی وہ خالی ذہن کے

ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔انوار بتاتا رہا۔

اگر پورا جلوس اکّا دکّا آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی۔ ویسے اپنی طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' اس نے یہ بات راز داری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹڑی پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔سرفرز انہ کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔

تب اسے یہ خاموش نہر، سنسان پٹڑی، اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگے تھے۔

اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑ پھڑاہٹ کی آواز ہوئی سرفراز نے سوچا پہلے اس پھڑ پھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

تو یہ احمد دوکاندار والا معاملہ کب ہوا تھا؟

''آج چار دن ہو گئے''

''ارے......'' سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟'' انوار نے پوچھا۔حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

''نہیں کچھ نہیں۔یعنی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔کچھ پتہ لگا؟

پتہ کیا لگتا۔ الٹے تھانے دار نے دفن کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج مُندے گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے۔''

پٹری سے اترتے ہی باغ سامنے آ گیا۔

گاڑی یہیں روک کر بیک کر کے لگا دو۔ آگے راستہ نہیں ہے۔'' انوار بولا۔''

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگا دی اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپیٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی

سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا، سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پل پار کر کے پکی سڑک پر آ گیا۔ سرفرازی شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

''اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟'' سرفراز نے گاڑی روک دی۔

''باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔''

صبیحہ انور

جیون گیان

چپلیں اتار کر جب میں نے زردی مائل سفید پتھروں والے فرش پر قدم رکھا تو ایک عجیب سی ٹھنڈک سراپا میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بچے مجھ سے آگے نکل چکے تھے، میں ابھی نچلی سیڑھیوں پر ہی کھڑی گرد و پیش کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔

''بدّھم، شرنم، گچھّامی، نووم۔نووم گچھامی'' کی پُر اسرار آوازوں سے سارا ماحول بوجھل تھا۔اونچے درختوں سے گھری سیڑھیوں پر چڑھتے ہوتے میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ دور پھاٹک پر نیلے رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔ میں اور میرے دونوں بچے گوتم بدھ کی آخری آرام گاہ کی سیر کا اشتیاق لیے زبردستی یہاں اتر پڑے تھے...... ہم لوگ ایک لمبے سفر سے واپس آرہے تھے۔ میرے شوہر کو سفر کے درمیان ایسی غیر سنجیدہ اور طویل تفریحیں قطعی پسند نہیں ہیں ...... گاڑی کے اکتا دینے والے سفر اور خراب موسم نے یونہی ان کا موڈ خراب کر رکھا تھا......اسی لئے اس وقت اس پُر اسرار معبد میں، میں بچوں کو گائیڈ کر رہی تھی اور وہ گاڑی میں

سگریٹ پیتے ہوئے ہم سب کا انتظار کر رہے تھے...... پھاٹک سے استوپ تک کافی لمبا راستہ ہے۔ ہم لوگ راستے میں نصب پیلے بورڈوں کو پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے...... جن پر کالی عبارت میں گوتم بدھ کی زندگی کی تفصیلات درج تھیں۔

گوتم بدھ کی زندگی میں تین درختوں کا ذکر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ پہلا درخت وہ تھا جس کے نیچے میکے جاتے وقت دورانِ سفر سدھارتھ کی ماں نے انھیں جنم دیا تھا...... دوسرا وہ اہم درخت، جس کے نیچے انھیں حقیقت کی روشنی...... یا جیون گیان ملا تھا۔ اور تیسرا وہ درخت تھا جس کے سائے میں انھیں بیماری، بڑھاپے اور موت کی فکروں سے نجات ملی تھی۔ میں نے غور سے ایک ایک کو پڑھا ......مگر درختوں کے سائے میں کہیں اس درخت کا ذکر نہیں تھا جس کا نام ''کلپ ترو'' تھا۔ دیو مالا کا وہ درخت جو سمندر منتھن سے نکلا تھا اور اس کے پھولوں سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی خوشبو سونگھی جا سکتی تھی......اور جس کے نیچے کی گئی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔

میں نے پنجوں کے بل پر اونچے ہو کر دیکھا نیچے ترائی میں دور تک جنگل سیڑھیاں اترتا چلا گیا تھا، ہر طرف سبز اندھیرا جھک آیا تھا۔ کہیں کہیں ہریالی کی آنکھ بچا کر زمین کا ٹکڑا جھانک لیتا تھا، درخت پتوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے۔ جنگل سے آنے والی تیز ہوا میں رچی ہوئی کھٹی خوش بو عجیب سا پیغام لا رہی

تھی۔......مگر ہریالی اور خوشبو کی اس بھیڑ میں '' کلپ تروا '' کون سا ہے؟ کیا یہ مہک '' کلاپ ترؤ ' کی ہے؟...... مجھے بتانے والا کوئی نہ تھا۔ زندگی کے ہرے بھرے جنگل میں کسی ایک درخت کی تلاش بھی کتنی مشکل ہے۔ساری عمر زندگی کے جنگل میں بن باس بھوگتے رہو، پیروں میں یادوں کے چھالے ہوں تو آرزوؤں کی چٹیل دھوپ میں سفر کتنا تکلیف دہ ہو جاتا ہے......مگر کلپ کی مہک نہیں آتی......' کلپ ترؤ' کی پہچان بڑی مشکل ہے۔

ایک تندرست سا بھکشو گلے میں مالا منکے ڈالے،عنابی رنگ کی عبا پہنے استوپ کے سائے میں پالتی مارے بیٹھا تھا......سر پر عنابی پیالہ نما ٹوپی لگائے۔وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھا۔میں اس کے پاس سے گزرتی ہوئی معبد کے اندر چلی گئی......وہ ٹکٹکی باندھے خلا میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

معبد کے اندر کی فضا بڑی گمبھیر تھی۔عود اور لوبان کے دھویں میں لپٹی ہوئی بدھم، بشرنم، گچھامی کی آوازیں بل کھا کھا کر اوپر اٹھ رہی تھیں۔ سامنے ہی تقریباً تین فٹ اونچے چبوترے پر ملکوتی مسکان ہونٹوں پر سجائے، بائیں کروٹ کی مدار میں گوتم بدھ کی مورتی تھی۔مورتی کے چہرے سے وہی جانا پہچانا سکون اور طمانیت برس رہی تھی جو گوتم بدھ نے صرف اپنے لیے مخصوص کر لی ہے۔کانوں کی لمبی لو کے اوپر بہت سے دائروں میں سمٹے ہوئے گھنگھرالے بالوں سے ٹپکنے والی بے پناہ آسودگی......میری بے چینی کے تلووں میں رشک بن کر کانچ کی طرح چبھ

گئی۔ آرزوؤں سے منہ موڑ کر کوئی بھلا اس طرح مسکرا سکا ہے۔؟

چبوترے کے بالمقابل لوبان دان اور اگر بتیوں کی قطار کے بعد چٹائیوں پر دور تک بدھ بھکشوؤں اور راہباؤں کا ایک گروہ آنکھیں بند کیے دعاؤں میں مصروف تھا۔ دعائیں۔ التجائیں۔ آرزوئیں اور حسرتیں جو ازل سے انسان کا مقدر رہیں۔ یہی آرزوئیں جب اظہار کا قالب پہنتی ہیں تو دل دکھاتی ہیں۔ ورنہ جب تک دل دھڑکتا ہے چپکے چپکے سانسیں لیتی رہتی ہیں۔ راہباؤں کے اونچے جوڑے اور لمبی سفید انگلیوں میں دبی ایک اجنبی رسم خط میں لکھی دعاؤں کی کتاب دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگا، جیسے یہ منظر میری آنکھوں کے لیے نیا نہ ہو...... بے خواب راتوں میں جانماز پر سر جھکائے ہوئے جانے کتنی سرد آہیں اور آنسو میری نظروں میں جھلملا اٹھے۔ معصوم اور سادہ تمناؤں کی فہرست بہت طویل تھی۔ اتنی طویل کہ اسے دہرانے کا میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں کسی معمول کی طرح اپنے بچوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی...... دونوں بچے ہال کا چکر کاٹتے ہوئے جیسے مورتی کے پیچھے چلے گئے تھے۔ پتہ نہیں یہ فضا پر چھائے ہوئے تقدس کا احترام تھا یا گوتم سدھارتھ کی نیند ٹوٹ جانے کا لحاظ کہ وہ آپس میں بہت چپکے چپکے بات کر رہے تھے اور دبے قدموں چل رہے تھے۔...... مورتی کے پیچھے کھڑے کھڑے ایک ٹورسٹ سے وہ شاید کچھ سوال کر رہے تھے۔ ان کی انگلیوں کے اشارے گول پنکھوں کی طرف تھے۔ جو کپڑے کے مختلف رنگوں کے ٹکڑے جوڑ کر بنائے گئے

تھے۔ان پنکھوں کی رنگا رنگی پر نظریں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔......جیسے موہوم وعدے، محدود لمحے، مجبور جذبے ہوں۔مگر جب مل کر جھلملاتے ہوں تو نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں......اور آنکھوں کے آگے دھند چھا جاتی ہے۔میں نے نظر بھر کر ان پنکھوں کو دیکھا۔کپڑے کے پھول اور موتیوں کی جھالروں سے سجے ہوئے پنکھے جن میں حسن تو تھا ہی مگر ساتھ میں پروئی ہوئی عقیدت اور وابستگی جیسے منہ سے بول رہی تھی لیکن سننے والا کوئی نہ تھا۔جیسے آنکھیں ہی نہیں، کان بھی بند ہوں۔دبیز تاریخی چادر پر ستاروں سے تین پنکھڑی والے پھول بنے تھے۔ ابدی نیند میں ڈوبی ہوئی مورتی......کورس میں گاتی ہوئی راہباؤں کی ٹولی اور ماحول پر طاری ایک گہری اداسی......کوئی نئی بات نہیں ہے۔میری آنکھوں کے لیے یہ منظر بہت پرانا ہے۔

امید اور ناامیدی کا یہ کھیل میں نے بار بار دیکھا ہے۔خواہشوں اور چاہتوں میں جکڑا ہوا انسان ......فنا اور بقا کی کشاکش میں گرفتار یہ ذات، اور سچ اور جھوٹ کی صلیب پر تڑپتی ہوئی یہ مخلوق...... سر پر امید و بیم کی لٹکی ہوئی تلوار کے ساتھ جینے والا یہ جاندار......ازل سے اضطراب اس کا مقدر ہے۔

دعائیں، امیدیں، سسکیاں۔پسیجی ہوئی ہتھیلیوں میں دبے دھاگوں کے بے ترتیب سرے جو کسی محراب کی جالی میں بندھے بندھے اپنی رہائی کی آس میں اپنی پہچان بھول جاتے ہیں کیونکہ وقت اپنی سرعت میں بجلی سے بھی تیز ہے۔مجھے ایسا لگا جیسے بھیڑ سے الگ ہو کر میرے پیچھے کھڑا کوئی اپنی جیبیں ٹٹول رہا ہو......

شرارت سے مسکرائی ہوئی اس کی آنکھیں دل کی باتیں کہہ رہی ہوں۔کوئی دھاگا ہو گا تمھارے پاس- لاؤ باندھا جائے۔سب کو تو آزما چکے، ذرا ان کو بھی آزمالیں" میں نے گھبرا کر جلدی سے دوپٹے سے ایک چٹ پھاڑ دی تھی۔فیروزی رنگ کی وہ چٹ کیا اب بھی وہیں بندھی ہوگی؟ کیا اپنا رنگ روپ کھو کر وہ آج بھی میری منتظر ہوگی......؟؟

ابھی پچھلے دنوں میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک بار وہاں گئی تھی......مگر باوجود تمام وعدوں سے آزاد ہونے کے مزار کے قریب جا کر کسی گرہ کو کھول دینے کی میں ہمت نہ کرسکی۔ کیونکہ کبھی کبھی انتظار میں بھی ایک تعلق ہوتا ہے......اور کسی کو اپنا منتظر رکھنا بھی بھلا لگتا ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ انتظار کا دوسرا نام ہی زندگی ہے......ظہور کا......تکمیل کا اور پھر فنا کا انتظار۔کسی کے انتظار میں ہمیشہ کے لیے کھلی رہ جانے والی آنکھیں......جن میں خواہش بھی ہوتی ہے، ارمان بھی۔ بے چینی بھی اور جستجو بھی......

اس انتظار اور ہجر کی جان لیوا تڑپ کا اندازہ راج محل کے سنہرے چھپر کھٹ پر نیند میں بے خبر اس راج کماری کو ہوسکتا ہے جس کا محبوب اس کے پہلو کو ٹھکرا کر اندھیری رات میں اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔کسی ان دیکھی سچائی اور نامعلوم نروان کی تلاش میں ......لیکن کیا سچ سے بڑھ کر دنیا کی کوئی سچائی ہے......حقیقت جو جاگتی آنکھوں کا منظر ہے۔جو سامنے ہے بس وہی سچ ہے اور سچائی تو یہ بھی ہے کہ

میں اپنی گرہستی میں مشغول اور مصروف عورت ہوں۔ میرا شوہر اور میرے بچے میری زندگی کا محور ہیں مگر سچائی یہ بھی ہے کہ میرا معصوم دل اپنے حالات کے خول میں پنجرے کے پنچھی کی طرح پھڑ پھڑاتا رہتا ہے...... مجھ سے سوال کرتا ہے۔ مجھے بے چین کرتا ہے......سدھارتھ نے مادی سکوں کو تیاگ کر نروان کی تلاش کی تھی۔ مگر میں مادی خوشیوں میں گلے گلے اتر کر ایک اَن دیکھے نروان کی تمنا کر رہی ہوں...... مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی کے راستے میں کوئی گھنا بٹ کا درخت نہیں ہے جس کے سائے میں، نروان، سکون کی شکل میں میرے اوپر برس جاتا، اور میری بے خواب آنکھوں پر بھی نیند کے بوجھل غلاف ہوتے، میں بھی تمام فکروں سے آزاد ہو جاتی۔

لیکن نروان کی یہ دولت شاید صرف راجکماروں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ لذتوں سے کنارہ کشی کے لیے پہلے ان میں ڈوبنا بھی لازمی ہے۔ لذتوں کے لیے بوند بوند ترسنے والا، لذت سے کنارہ کشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا......میرے اوپر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو چکی ہے کہ گرتی ہوئی دیواروں کے سائے میں رہنے والے کی آنکھیں سنہری چھتوں کے سپنے آسانی سے نہیں توڑ پاتیں۔ اسی لیے اپنی بے خواب راتوں کا ذمہ دار، میں نے تمھیں کبھی نہیں ٹھہرایا...... کیونکہ قصور تمہارا نہیں ہے......تم نے اپنی محبت کا محل اور محبوب کا پہلو رات کے اندھیرے میں نہیں چھوڑا تھا۔...... بلکہ دن کے اجالے میں ایک نئی سمت اس لیے پرواز کر گئے تھے کہ رفیق

سفر کی شکل میں ایک آرام دہ زندگی تمھارا انتظار کر رہی تھی......تم دبے پاؤں بھی نہیں گئے تھے اور نہ ہی تم نے پہرے داروں کے سو جانے کا انتظار کیا تھا...... میں نے تمھاری اداس آنکھوں میں وہ تمام سمجھوتے پڑھ لیے تھے جو تمہاری مجبوری تھے۔ اچھی زندگی گزارنے کی خواہش...... ماں باپ کے خوابوں کی تکمیل......اور بھائی بہنوں کے چہروں پر سوالیہ نشان کی طرح چسپاں ان کا مستقبل......تمھارے چہرے سے عیاں تھا۔

اگر زندگی خواہشوں کی تکمیل کا نام ہے تو میں بھی ایک مکمل زندگی کی مالک ہوں۔ میں نے تمہارے ہجر میں کون سے تنکے چنے...... بظاہر تو میں بھی اپنی جگہ پر اتنی ہی پرسکون ہوں جتنے تم اپنے ایرکنڈیشنڈ گھر میں ہو گے......ہم دونوں ہی سنہری چھتوں کے نیچے پیدا نہیں ہوئے۔ شاید اسی لیے ان حسین سپنوں کو نہ توڑ سکے۔ پتہ نہیں ہم کتنے غلط ہیں اور کتنے صحیح......!!

زندگی کے سربستہ رازوں کے انکشاف کے لئے بے چین رہنے والے گوتم سدھارتھ کو گہری نیند میں سوتے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں اس کا شانہ ہلا کر اس سے پوچھوں۔ سدھارتھ تم نے تو صرف ایک بڑھاپا دیکھا تھا اور زندگی کے بوجھ سے گھبرا گئے۔ کاش کہ تم نے مجبور اور معذور آنکھوں کی وہ تھکن دیکھی ہوتی جہاں زندگی ایک بوجھ ہے، اور موت محبت بھری تھپکی......اندھیرے سے اجالے کی جانب ایک جست – سدھارتھ کی بند آنکھوں سے یقین کی کرنیں پھوٹتی ہیں تو

پھوٹتی رہیں، میں یہ سوال کیسے نہ کروں کہ تم تو صرف ایک بیمار کو دیکھ کر کراہ اٹھے تھے۔ تم کتنے خوش قسمت تھے کہ تم نے ایڑیاں رگڑتے موت کی بھیک مانگتے، مارفیا اور پیتھیڈین کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتے اور نلکیوں کے سہارے زندگی کی آس میں موت کی طرف تل تل گھسٹتے انسانی ڈھانچے نہیں دیکھے۔

محفوظ اور مامون راج محل کے کسی جھروکے سے اداس کاندھوں پر رکھا ہوا ایک جنازہ دیکھ کر تم زندگی کے اس روپ کی تاب نہ لا سکے تھے۔ اچھا ہوا کہ ایٹمی دھماکے، جنگ اور قحط سالی کی وہ تصویریں نہیں دیکھیں جن کی ہماری آنکھیں عادی ہو چکی ہیں ...... سچ میں کتنے سادہ لوح تھے تم اور کتنی معصوم تھیں تمھاری آنکھیں بہت سی بے چین آتمائیں بدھم، شرنم کی صداؤں، تکونی جھنڈیوں، زیرلب دعاؤں اور منکوں کی غیر محسوس گردش میں تمھارے ذریعے موکش کی منتظر ہیں۔ مجھے ہی نہیں تمھیں بھی معلوم ہے کہ کبھی کبھی کسی کو اپنا منتظر رکھنا بھی بھلا لگتا ہے۔ سنہری پھولوں سے لدی زرد دبیز چادر میں لپٹے ہوئے اس راج کمار سے کاش میں پوچھ سکتی کہ کیا تم نے ان منتظر آنکھوں، بے قرار سانسوں، پرامید صداؤں اور سوگوار لہجوں سے بھی نروان پالیا ہے؟ ورنہ تمھاری گھنگری زلفوں میں ترتیب وار حلقوں اور آگہی کے بوجھ سے جھکے ہوئے کانوں میں بے خبری اور ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نیند کیسے ممکن ہوئی ...... مگر میرے پاس سوالوں کے جواب پانے کا وقت ہی کہاں تھا ...... کیونکہ وقت ہی ایک اٹل حقیقت ہے۔ ...... میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

زائرین کی ایک بڑی ٹولی معبد کے اندر غیر مانوس جملے دہراتی ہوئی، داخل ہورہی تھی......احترام اور ادب کے ساتھ۔

میرے بچے معبد سے نکل کر میرے منتظر تھے۔...... باہر تیز ہوا کسی طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔......جنگل سے آنے والی خوشبو بھولی بسری یادوں کی طرح دل کے دروازوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔عنابی عبا اور گول ٹوپی والا بھکشو بڑی تیزی سے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا جیسے اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔ لمبے ڈگوں سے بودھ وہار کی اونچی نیچی دیواروں کو پھلانگتا ہوا۔

استوپ کے چاروں طرف بنی کشادہ سڑک پر چلتی ہوئی میں بچوں کے ساتھ باہر آگئی جہاں ڈرائیور کے ساتھ میرے شوہر میرے منتظر تھے۔

زندگی کے ہرے بھرے جنگل میں ''کلپ ترؤ'' کی تلاش بے سود ہے۔ گوتم بدھ کی لازوال مسکراہٹ سب کو جیون گیان بانٹ رہی تھی۔

علامہ اقبالؔ

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہجاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو
ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کردے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالہ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

میراجی

مجھے گھر یاد آتا ہے

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو
یہ پھیلا آسماں اُس وقت کیوں دل کو لبھاتا تھا
ہر اک سمت اب انوکھے لوگ ہیں اور ان کی باتیں ہیں
کوئی دل سے پھسل جاتی، کوئی سینے میں چبھ جاتی
انھی باتوں کی لہروں پر بہا جاتا ہے یہ بجرا
جسے ساحل نہیں ملتا

میں جس کے سامنے آؤں مجھے لازم ہے لیکن مسکراہٹ میں کہیں یہ ہونٹ
''تم کو جانتا ہوں'' دل کہے ''کب جانتا ہوں میں''
اپنی لہروں پہ بہتا ہوں، مجھے ساحل نہیں ملتا۔

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو

وہ کیسی مسکراہٹ تھی، بہن کی مسکراہٹ تھی، مرا بھائی بھی ہنستا تھا
وہ ہنستا تھا، بہن ہنستی ہے، اپنے دل میں کہتی ہے
یہ کیسی بات بھائی نے کہی، دیکھو وہ امّاں اور ابّا کو ہنسی آئی
مگر یوں وقت بہتا ہے، تماشا بن گیا ساحل
مجھے ساحل نہیں ملتا

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو
یہ کیا پھیر ہے، تقدیر کا یہ پھیر تو شاید نہیں، لیکن
یہ پھیلا آسماں اُس وقت کیوں دل کو لبھاتا تھا؟

حیاتِ مختصر سب کی بہی جاتی ہے اور میں بھی
ہر اک کو دیکھتا ہوں، مسکراتا ہے کہ ہنستا ہے
کوئی ہنستا نظر آئے، کوئی روتا نظر آئے
میں سب کو دیکھتا ہوں، دیکھ کر خاموش رہتا ہوں
مجھے ساحل نہیں ملتا

نظیر اکبر آبادی

روٹیاں

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں کی لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے پر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کے ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بہ جا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولہا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے

جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے توے تنور کا جس جا زباں پہ نام
یا چکی چولھے کے جہاں گل زار ہوں تمام
واں سر جھکا کے کیجیے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انہیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں
ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں بور بور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں
پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا طور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے
گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
وہ تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے
چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اب آگے جس کے مال پوے بھر کے تھال ہیں
پورے بھگن انہیں کہو صاحب کے لال ہیں
اور جن کے آگے روغنی اور شیر مال ہیں
عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
پکی پکائی اب جنہیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

اسرارالحق مجازؔ

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا
متاعِ سوز و ساز زندگی پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
ملا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا
ہوس کاری ہے جرم خودکشی میری شریعت میں
یہ حد آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا
نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی

میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی دل کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بے خودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا
کہاں تک قصہ آلام فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

مولوی عبدالحق

اسم اور اس کی قسمیں

اسم وہ لفظ ہے جو کسی کا نام ہو

اسم کی دو قسمیں ہیں

ا۔خاص ۲۔عام

خاص:

کسی شخص یا شئے یا مقام کا نام۔مثلاً علاء الدین، کلکتہ، گنگا

عام:

وہ اسم ہے جو ایک قسم کے تمام افراد کے لئے فرداً فرداً استعمال ہو سکے جیسے آدمی، گھوڑا، درخت، کتاب

اسم خاص:

اشخاص کے اسم خاص بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔مثلاً

ا۔خطاب: نام جو بادشاہ یا سرکار دربار سے اعزازی طور پر ملتا ہے۔اقبال الدولہ، عماد الملک۔

۲۔ لقب: ایک وصفی نام جو کسی خصوصیت یا وصف کی وجہ سے پڑ گیا ہو۔ جیسے مرزا نوشہ لقب ہے اسداللہ خاں غالب کا یا کلیم اللہ لقب ہے حضرت موسیٰ کا۔

۳۔ عرف: وہ نام ہے جو محبت یا حقارت کی وجہ سے پڑ جائے یا اصل نام کا اختصار لوگوں کی زبان زد ہو جائے۔ جیسے چٹو، کلن، فخرو، اچھے میاں

۴۔ تخلص: ایک مختصر نام جو شاعر نظم میں بجائے اصلی نام کے داخل کر دیتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ تخلص ہے مرزا اسداللہ خاں کا۔ حالیؔ تخلص ہے مولانا الطاف حسین کا۔

اس کے علاوہ ممالک، دریاؤں اور پہاڑوں کے اور دیگر جغرافیائی اسماء اور علم وفنون وامراض وغیرہ کے نام سب اسم خاص ہوں گے۔

بعض اوقات اسم خاص اسم کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے رستم، حاتم وغیرہ مثلاً یوں کہیں کہ وہ شخص اپنے وقت کا حاتم ہے۔ یا وہ رستم ہند ہے یا فلاں شخص قیس یا فریاد ہے۔ یا وہ سعدی یا کالیداس ہے۔ ایسے موقعوں پر رستم سے بڑا پہلوان، حاتم سے بڑا سخی، قیس وفریاد سے بڑے عاشق، سعدی اور کالیداس سے بڑے شاعر مراد ہیں۔

اردو میں اسم عام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

اسم کیفیت، اسم جمع، اسم ظرف، اسم آلہ اس کی چند قسمیں ہیں۔

اسم کیفیت:

وہ اسم ہے جس سے کوئی خاص حالت یا کیفیت معلوم ہوتی ہو۔ جیسے سخی، روشنی،

صحت، جلن۔

اسمائے کیفیت دو چیزیں ظاہر کرتے ہیں۔

اول حالت جیسے صحت، نیند، رفتار، سچ، جھوٹ۔

دوم وصفی کیفیت مثلاً درد، خوشی، مطالعہ۔

اسمائے کیفیت کیونکر بنتے ہیں؟

۱۔ بعض فعل سے بنتے ہیں۔ مثلاً چال چلن، گھبراہٹ، لین دین۔

۲۔ بعض صفت سے بنتے ہیں۔ مکاری، خوشی، کھٹائی، دیوانہ پن۔

۳۔ بعض اسم سے بنتے ہیں۔ جیسے دوست سے دوستی، لڑکے سے لڑکپن

۴۔ اکثر عربی، ہندی، فارسی کے الفاظ اسمائے کیفیت کا کام دیتے ہیں۔ جیسے: صحت، حسن، حرکت، بل، کوشش، جوش۔

۵۔ ایک لفظ کی تکرار یا دو لفظوں کے ملنے سے۔ جیسے بک بک، چھان بین، جان پہچان، خوشبو۔

اسم ظرف:

وہ اسم ہے جس میں جگہ یا وقت کے معنی پائے جائیں۔ مثلاً گھر، میدان، جھرنا، چراگاہ۔

بعض علامات ایسی ہیں کہ ان کے لگانے سے اسم ظرف بن جاتا ہے۔

بعض ان میں سے ہندی ہیں اور بعض فارسی۔

ہندی علامات سال (بمعنی جگہ) جیسے گھڑ سال (گھوڑوں کے رہنے کی جگہ)۔ٹکسال (جہاں ٹکے یعنی سکہ بنایا جاتا ہے)۔

شالہ یا سالہ جیسے دھرم سالہ، پاٹ شالہ، گئوسالہ۔استھان (فارسی ستان) دیواستھان، پرستان، آل۔یال جیسے: سسرال، ننہیاں، ددھیال

آنہ: سمدھیانہ، سرھانہ۔

کا: جیسے میکا (ماکا)

بعض خاص الفاظ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر اسم ظرف کے معنی دیتے ہیں۔مثلاً ٹولہ سے قاضی ٹولہ

کھاٹ یا گھٹ: مرگھٹ، پن گھٹ، دھوبی گھاٹ

واڑہ، باڑہ۔جیسے سیدواڑہ، قصائی باڑہ۔

واری۔: پھلواری۔

پارہ۔جیسے: اوپر پارہ

دوار، دوارہ۔جیسے ہردوار، گردوارہ، ٹھاکردوارہ

گھر۔جیسے: ڈاک گھر، ریل گھر، ناچ گھر

نگر۔جیسے سری نگر، احمد نگر۔

پور، پورہ۔جیسے غازی پور، شولاپور، عثمان پورہ

گڈھ۔ جیسے علی گڈھ، آسمان گڑھ۔

منڈی۔ جیسے: دال منڈی، سبزی منڈی۔

فارسی علامات:

خانہ۔ کتب خانہ۔ ہندی وغیرہ الفاظ کے ساتھ جیسے چنڈوخانہ، چڑیا خانہ، جیل خانہ، ڈاک خانہ

گاہ۔ چراگاہ، شکارگاہ، بارگاہ، درگاہ۔

دان۔ چاءدان، قلم دان، عطردان، ہندی الفاظ کے ساتھ۔ جیسے پاندان، خاصدان، پیک دان۔

دانی (ہندیوں کا تصرف ہے) سرمہ دانی، تلے دانی۔

زار۔ سبزہ زار، لالہ زار، مرغزار۔

سار۔ کوہسار۔

ستان۔ گلستان، پرستان، کوہستان۔

سرا۔ جیسے: کارواں سرا۔ مہمان سرا۔ کدہ۔ جیسے: آتش کدہ۔

آباد۔ حیدرآباد، اورنگ آباد، اکبرآباد۔

شن۔ گلشن

بعض اوقات فعل سے بھی اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بیٹھنا سے بیٹھک، پینا سے پیاؤ۔

کبھی فعل اور اسم کے ملنے سے اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بُد رُود، آب چک۔

رمنا اور جھرنا دونوں مصدر ہیں۔ مگر یہ اسم ظرف کے معنوں میں بھی مستعمل ہیں۔ رمنا کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ظرفی معنی پھرنے کی جگہ یعنی چراگاہ کے ہیں۔ جھرنا کے معنی پانی رسنے کے ہیں۔ ظرفی معنی وہ مقام جہاں سے پانی رستا ہے۔

عربی میں اسم ظرف مفعل اور مفعلہ کے وزن پر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اردو میں بھی رائج ہیں۔ مثلاً مکتب، مدرسہ، مقبرہ، مسجد، مجلس، مرقد، مقام، مزار، محشر، مقتل، منبع، مخرج، ماخز وغیرہ۔

اسم آلہ:

وہ اسم جو آلہ یا اوزار کے معنوں میں آئے۔ مثلاً چاقو، تلوار، ہتوڑا، درانتی۔

ا۔ بعض اسم آلہ فعل سے بنائے گئے ہیں۔

بیلنا سے بیلن، جھولنا سے جھولا۔

دھونکنا سے دھونکنی، جھاڑنا سے جھاڑو۔

چھاننا سے چھلنی، پھانسنا سے پھانسی۔

لٹکنا سے لٹکن، کترنا سے کترنی، پھونکنا سے پھکنی۔

۲۔ بعض اسم سے بھی بنتے ہیں۔ جیسے:

نہرنا یا نہرنی (بہ معنی ناخن)

ہتوڑا (ہاتھ سے)

دتون (دانت سے)

۳۔ دو اسم مل کر جیسے: دستپنا (دست پناہ) منال (منہ، نال)

۴۔ فارسی اسماء کے آگے بعض علامات یا الفاظ بڑھانے سے بنائے گئے ہیں:

ہ کے بڑھانے سے: جیسے دست سے دستہ، چشم سے چشمہ۔

آنہ۔ جیسے: انگشت سے انگشتانہ، دست سے دستانہ۔

گیر۔ جیسے: کف گیر، گلگیر، آتشگیر۔

کش۔ جیسے: بادکش، دودکش۔

تراش۔ جیسے: قلم تراش

دان۔ جیسے چوہے دان، قلم دان۔

۵۔ عربی کے اسمائے آلہ جو اکثر مفعل مفعلہ یا مفعال کے وزن پر ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً: مقراض، مشعل، منقار، مسواک، میزان، مضراب، مسطر، منبر، مصقلہ۔

اسم جمع:

بعض اسم ایسے ہوتے ہیں کہ صورت میں تو واحد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کئی اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جیسے فوج، انجمن، قطار، جھنڈ۔ اس قسم کے اسم کو اسمِ جمع کہتے ہیں۔

....

ضمیر

وہ الفاظ جو بجائے اسم کے استعمال کئے جاتے ہیں، ضمیر کہلاتے ہیں۔ جیسے وہ نہیں آیا۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔ اس میں (وہ) اور (میں) ضمیر ہیں۔ ضمیر سے فائدہ یہ ہے کہ بار بار انھیں اسماء کو جو گزر چکے ہیں دہرانا نہیں پڑتا اور زبان میں الفاظ کے دہرانے سے جو بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہیں ہونے پاتی۔

ضمیر کی قسمیں

(۱)شخصی (۲)موصولہ (۳)استفہامیہ (۴)اشارہ (۵)تنکیر

(۱)ضمیر شخصی:

وہ ہے جو اشخاص کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک وہ جو بات کرتا ہے۔ اسے متکلم کہتے ہیں۔

دوسرا وہ جس سے بات کی جاتی ہے۔ اسے مخاطب کہتے ہیں۔

تیسرا وہ جس کی نسبت ذکر کیا جاتا ہے۔ اسے غائب کہتے ہیں۔

ضمائر کی حالتیں وہی ہوتی ہیں جو اسم کی ہیں (سوائے حالت خبری کے) ہر ایک کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

ضمائر متکلم

	واحد	جمع
فاعلی حالت	میں	ہم
مفعولی حالت	مجھے یا مجھ کو	ہمیں یا ہم کو
اضافی حالت	میرا	ہمارا
ظرفی حالت	مجھ میں	ہم میں
طوری حالت	مجھ سے	ہم سے

ضمائر مخاطب:

	جمع	واحد
فاعلی حالت	تو	تم
مفعولی حالت	تجھے یا تجھ کو	تمہیں یا تم کو
اضافی حالت	تیرا	تمہارا

ظرفی حالت

تم میں	تجھ میں

طوری حالت

ہم سے	تجھ سے

ضمائر غائب:

فاعلی حالت	وہ	وہ
مفعولی حالت	اسے یا اس کو	ان کو یا انہیں
اضافی حالت	اسے یا اس کو	ان کا
ظرفی حالت	اس میں	ان میں
طوری حالت	اس سے	ان سے

اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ضمائر غائب میں واحد اور جمع دونوں کے لئے (وہ) آتا ہے اور اس میں اشخاص اور اشیاء کا امتیاز نہیں ہوتا۔ پرانی اردو میں واحد کے لئے (وو) اور جمع کے لئے (وے)استعمال ہوتا تھا۔

(تو) بے تکلفی اور محبت کے لئے آتا ہے۔ جیسے ماں، بچے سے، گرو چیلے سے باتیں کرتا ہے۔ یا مخاطب کی کم حیثیتی کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے آقا نوکر سے باتیں کرتے وقت استعمال کرتا ہے۔

بعض اوقات بہت بے تکلف دوست بھی تو کہہ کر باتیں کرتے ہیں۔

نظم میں اکثر مخاطب کے لئے (تو) لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے لوگوں

اور بادشاہوں کو بھی اسی طرح خطاب کیا جاتا ہے۔

بعد شاہانِ سلف کے تجھے یوں ہے تفصیل
جیسے قرآن پس توریت وزبور وانجیل (ذوقؔ)

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے (میر)

دعا مانگتے وقت خدا سے 'تو' سے خطاب کیا جاتا ہے۔ دوسرے مواقع پر واحد مخاطب کے لئے 'تم' ہی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ سوائے بے تکلفی کے موقع کے، تم بھی اکثر نوکروں اور چھوٹے لوگوں سے خطاب کرتے وقت بولا جاتا ہے۔ ورنہ اکثر اور عموماً واحد مخاطب اور جمع مخاطب دونوں کے لئے (آپ) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آپ، تعظیماً واحد غائب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے اگر چہ لوگ طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، مگر آپ کو کبھی ملال نہ ہوتا۔ یا جب کوئی شخص کسی کو دوسرے سے ملاتا تو تعظیماً کہتا ہے کہ آپ فلاں شہر کے رئیس ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(ہم) ضمیر متکلم جمع میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بڑے لوگ بجائے واحد متکلم کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل کیوں نہیں کی گئی، نظم میں یہ تخصیص نہیں۔ واں اکثر واحد متکلم کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　　بے نیازی تیری عادت ہی سہی

؎ ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

کبھی متکلم عمومیت کے خیال سے (ہم) استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یہ چند روزہ صحبت غنیمت ہے ورنہ پھر ہم کہاں تم کہاں۔

ہماری قسمت ہی بری ہے جو کام کیا بگڑ گیا۔ وہ بڑے ضدی ہیں کسی کی کیوں ماننے لگے۔ آخر ہمیں کو دینا پڑے گا۔

بعض اوقات اس کا استعمال مبہم ہو جاتا ہے اور صحیح طور سے نہیں معلوم ہوتا ہے متکلم کے ساتھ کون شریک ہے۔ مثلاً کوئی کہئے ''میرا ساتھ کون دے گا۔'' اس کے جواب میں دوسرا شخص کہے۔ ''ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے''۔ اگر یہ کہنے والا واحد ہے، مگر دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے۔

بعض اوقات اس کے ساتھ دوسرے الفاظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: ہم رعایائے سرکار، ہم شرکائے مجلس۔

کبھی کبھی محض انکسار کی غرض سے جب کہ اپنی شخصیت کا اظہار سننے والوں کے سامنے مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ گویا متکلم اپنی رائے یا فعل کو دوسروں کی آڑ میں چھپا لیتا ہے۔ جیسے ہماری رائے میں تعلیم کی اصلاح میں نہایت سرگرمی سے کوشش کرنی چاہئے۔

اس کا استعمال زیادہ تر اخباروں کے اڈیٹر کرتے ہیں جو گویا اہل ملک کے نائب ہیں۔

بعض اوقات یار اور یاروں کا لفظ واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: یار تو گوشۂ تنہائی میں رہتے ہیں، کہیں آ ئیں نہ جائیں۔ یاروں سے بچ کر کہاں جائے گا۔ یاروں کا لفظ واحد متکلم اور جمع متکلم دونوں کے لئے آتا ہے۔ مگر عموماً بے تکلفی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعمال کسی قدر عامیانہ سمجھا جاتا ہے۔

کیا مدنظر تم کو ہے یاروں سے تو کہئے　　　گر منھ سے کہتے

اشاروں سے تو کہئے (ذوقؔ)

جب کسی جملے میں کوئی اسم یا ضمیر فاعلی حالت میں ہو اور وہی مفعول بھی واقع ہو تو بجائے ضمیر مفعولی کے آپ کو ''اپنے تئیں'' یا ''اپنے آپ'' کو استعمال کرتے ہیں جیسے احمد آپ کو دور کھینچتا ہے یا اپنے تئیں بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ یا اپنے کو فاضل خیال کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی اسم یا ضمیر کسی فقرے میں فاعل ہے اور اس کی اضافی حالت لانی منظور ہو تو بجائے اصل ضمیر اضافی کے اپنا، اپنی یا اپنے حسب موقع استعمال ہوں گے۔ جیسے: امجد اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ تم اپنا کام کرو، مجھے اپنے کام سے فرصت نہیں۔ وہ خود تو چلے گئے مگر اپنا کام مجھ پر چھوڑ گئے۔ یہ اسی حالت میں جب کہ فاعل ایک ہو۔ اگر فاعل الگ الگ ہیں تو (اپنے) کی ضمیر نہیں آئے گی بلکہ جس ضمیر کا موقع ہوگا اس کی اضافی حالت لکھی جائے گی۔ جیسے: وہ تو چلے گئے مگر ان کا کام مجھ پر آ پڑا۔ یہاں چلے گئے کا فاعل ''وہ'' ہے۔ اور آ پڑا کا فاعل 'ان کا کام

ہے، جیسے تم چلے گئے مگر تمہارا کام انہوں نے مجھے سونپ دیا کا فاعل انہوں نے۔
اپنے) ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے کام سے غافل ہے۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں۔
دراصل ایسے فقروں میں اصل ضمیریں اپنا، اپنی سے بدل گئی ہیں۔ مثلاً: مجھے اپنے کاموں سے فرصت۔ اصل میں تھا، مجھے میرے کاموں سے فرصت نہیں۔
آپ اور اپنا دوسرے ضمائر کے ساتھ تاکید کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً: حالت فاعلی، میں آپ آ گیا تھا۔ وہ آپ آئے تھے، تم آپ گئے تھے، حالت اضافی میں جیسے میرا اپنا کام تھا۔ یہ ان کا اپنا باغ ہے۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام

(غالبؔ)

فارسی کا لفظ خود بھی (جس کے معنی آپ یا اپنے کے ہیں) انھیں معنوں میں آتا ہے۔

جیسے: انھوں نے خود فرمایا۔ خود بعض حالتوں میں زیادہ فصیح ہے اور خصوصاً حالت مفعولی میں۔ جیسے: میں نے خود اسے دیا۔ یہاں خود کے استعمال سے ابہام پایا جاتا ہے کے خود کا تعلق (میں) سے ہے یا (اسے) سے۔ لہٰذا اس کے رفع کے لئے ایسے موقعوں پر استعمال کی یہ صورت ہونی چاہئے کہ جس لفظ سے اس کا تعلق ہو اس کے اول استعمال کیا جائے مثلاً اگر یہاں خود کا تعلق (میں) سے ظاہر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے۔ ''خود میں نے اسے دیا'' مگر حالت اضافی میں خود کا کہنا فصیح نہیں

ہے۔ایسے موقعے پر (اپنا) زیادہ فصیح رہے گا۔مثلاً: ''خود کا خود کرنا چاہئے۔'' کی بجائے ''اپنا کام آپ کرنا چاہئے''، زیاد فصیح ہوگا۔

۲۔ضمیر موصولہ:

وہ ہے جو کسی اسم کے بجائے آتی ہے۔مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس کے اسم کا بیان ہوتا ہے، جیسے وہ کتاب جو کل چوری گئی تھی ،مل گئی۔ آپ کے دوست جو چیچک رو ہیں مجھے ملے تھے۔پہلے جملے میں 'جو' کتاب کے لئے اور دوسرے میں 'جو' دوست کے لئے۔اور ساتھ کے جملوں میں دونوں اسموں کا بیان ہے۔

ضمیر موصولہ صرف (جو) ہے،جس کی مختلف حالتیں یہ ہیں۔

	واحد	جمع
	جو،(حرف نے کے ساتھ)	جو، (حرف نے کے ساتھ)
فاعلی حالت	جس نے	جنھوں نے
مفعولی حالت	جس کو یا جسے	جن کو یا جنہیں
	(مذکر) جس کا	جن کا

اضافی حالت	(مونث) جس کی	جن کی
ظرفی حالت	جس میں	جن میں
طوری حالت	جس سے	جن سے

جن کو، جنہیں، جنہوں نے، جن کا، اگر چہ جمع ہیں مگر تعظیماً واحد کے لئے بھی آتے ہیں جس اسم کے لئے یہ ضمیر آتی ہے، اسے مرجع کہتے ہیں۔

ضمیر موصولہ ہمیشہ ایک جملے کے ساتھ آتی ہے اور دوسرا جملہ اس کے جواب میں ہوتا ہے۔ مثلاً: وہ کتاب جو کل خریدی تھی جاتی رہی۔ اس میں دو جملے ہیں۔ ایک 'جو کل خریدی تھی' دوسرا وہ کتاب جاتی رہی'۔ اس میں 'جو' ضمیر موصولہ ہے۔

(جو) حالت فاعلی میں واحد اور جمع دونوں میں یکساں استعمال ہوتا ہے مگر جب فاعل کے ساتھ 'نے' ہو تو واحد میں (جو) بھیس بدل کر (جس) اور جمع میں (جنہوں) ہو جاتا ہے۔ مثلاً جس نے ایسا کیا برا کیا۔ وہ لوگ جنہوں نے قصور کیا تھا معاف کر دیئے گئے۔

کبھی (جو) کے جواب میں فقرۂ ثانی میں (سو) آتا ہے۔ جیسے جو ہو سو ہو۔ جو چڑھے گا سو گرے گا۔

(جَون) بھی ہندی ضمیر موصولہ ہے مگر اردو میں (سا) کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے ان میں سے جَون سا چاہو لے لو۔ جمع میں (جون سے) اور واحد و جمع مؤنث میں (جون سی) استعمال ہوتا ہے۔

کبھی (کہ) بطور ضمیر موصولہ کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔

میں کہ آشوب جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت　　　　امن کو سمجھا
غنیمت دل غم دیدہ بہت (آزاد)

جو، جس اور جن بہ تکرار بھی آتے ہیں اور واحد یا جمع کی حالت میں ان کا اطلاق فرداً فرداً ہوتا ہے۔ مثلاً: جو جو پسند ہو لے لو۔ جن جن کے پاس گیا انہوں نے یہی جواب دیا۔

ضمائر استفہامیہ:

جو سوال پوچھنے کے لئے آتی ہیں دو ہیں۔ کون اور کیا (کون) جاندار کے لئے آتا ہے۔ (کیا) بے جان کے لئے۔

جیسے: کون کہتا ہے، کیا چاہیئے۔

(کون) کی مختلف حالتیں یہ ہیں:

	واحد	جمع
فاعلی حالت	کون اور (نے کے ساتھ)	کون (نے کے ساتھ)
	کس نے	کنھوں نے
مفعولی حالت	کیسے یا کسی کو، کس سے،	کن کو یا کنھیں، کن سے
اضافی حالت	کس کا	کن کا

ظرفی حالت	کس میں	کن میں
طوری حالت	کس سے	کن سے

جیسے: کون کہتا ہے، کس نے کہا، کس کے پاس ہے، کس کو دیا؟ کن، اب صورت فاعلی میں کبھی ضمیر کے بجائے نہیں آتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے: کن لوگوں نے کہا؟

کس کس، کن کن اور کیا کیا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: کس کس کو روؤں، کن کن سے کہوں، کیا کیا کروں۔

کون کون بھی بولتے ہیں جیسے وہاں کون کون تھے؟ ان فقروں میں فعل کئی اشخاص یا اشیاء پر فرداً فرداً واقع ہوتا ہے اور جمع کا ہونا بتاتا ہے۔

کون سا (کون سی، کون سے) بھی بجائے ضمیر مستعمل ہے۔ کون اور 'کون سا' میں فرق اتنا ہے کہ (کون سے) میں ذرا خصوصیت پائی جاتی ہے اور یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ کئی چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب مقصود ہو۔ مثلاً: ان میں سے کون سی چاہیئے؟ یہاں (کون) نہیں کہیں گے (سا) کے ساتھ (کون) اشخاص اور اشیاء دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ضمائر اشارہ:

جو بطور اشارہ کے استعمال ہوتی ہیں ''وہ'' بعید کے لئے۔ ''یہ'' قریب کے لئے۔ ضمائر اشارہ اور ضمائر غائب شخصی ایک ہی ہیں۔ لیکن جب بطور اشارہ استعمال ہوتی ہیں تو انھیں ضمائر اشارہ کہتے ہیں۔ جیسے: وہ لوگے یا یہ۔ حروف ربط کے آنے سے وہ اُس سے اور یہ اس سے بدل جاتا ہے۔ اور جمع میں اُن اور ان ہو جاتا ہے۔

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز　　　اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں

ضمائر تنکیر:

وہ ہیں جو غیر معین اشخاص یا اشیاء کے لئے آئیں۔

ضمائر تنکیر دو ہیں، ''کوئی'' اور ''کچھ''

(کوئی) اشخاص کے لئے اور (کچھ) اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ہے؟ کوئی نہیں بولتا۔ کچھ ہے یا نہیں؟ کچھ نہ کہو۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟ حروف ربط کے آنے سے 'کوئی' کی صورت 'کسی' ہو جاتی ہے۔ جیسے: کسی کے پاس نہیں۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

جب یہ ضمائر تکرار کے ساتھ کوئی کوئی اور کچھ کچھ استعمال ہوتے ہیں تو اس میں خاص زور پایا جاتا ہے۔ مگر معنی قلت کے آتے ہیں۔ جیسے: اب بھی کوئی کوئی نظر پڑ جاتا ہے۔

اگر چہ نایاب ہے مگر کسی کسی کے پاس اب بھی مل جاتی ہے۔ ابھی کچھ کچھ درد باقی

ہے۔نفی کے ساتھ بھی بہ تکرار آ تا ہے۔ جیسے: ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔
کوئی نہ کوئی مل ہی رہے گا۔

عربی کے الفاظ 'بعض' اور 'بعضے' بھی ضمیر تنکیر کا کام دیتے ہیں۔بعض کا یہ خیال ہے۔بعض یہ کہتے ہیں۔ ''بعض'' تکرار کے ساتھ بھی آ تا ہے۔ جیسے بعض بعض ایسے بھی ہیں۔اسی طرح 'فلاں'، 'کل' اور 'چند' بھی بطور ضمیر تنکیر کے استعمال ہوتے ہیں۔

ضمائر تنکیری دوسرے ضمائر کے ساتھ مل کر مرکب بھی آتی ہیں جیسے جو کوئی، جو کچھ، جس کسی، ہر کوئی۔ جیسے: جس کسی کو کہتا ہوں وہ الٹا مجھی کو قائل کرتا ہے۔ جو کچھ کہو بجا ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ جو کچھ ہے غنیمت ہے۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

حبیب تنویر

شطرنج کے مہرے

یہ ڈراما پریم چند کی کہانی شطرنج کی بازی سے ماخوذ ہے۔ یہاں ڈرامے کا تیسرا اور آخری ایکٹ دیا گیا ہے۔ پہلے اور دوسرے ایکٹ میں میر اور مرزا اپنے گھروں میں شطرنج کھلتے ہیں۔ پھر لکھنؤ پر انگریزی حملے کی خبر سن کر گومتی کے کنارے چلے آتے ہیں اور یہاں ایک شکستہ مسجد کے کھنڈر میں آ کر بساط بچھاتے ہیں

۔

ڈرامے کا یہ حصہ جامعہ ملیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹیج پر حبیب تنویر صاحب کی زیر ہدایت پیش کیا جا چکا ہے۔

..................................اطہر پرویز

ایک قدیم مسجد کا کھنڈر۔ اسٹیج کے بیچ میں ایک ٹوٹا ہوا ستون ہے دیواروں پر سبزہ اگ رہا ہے اور اُجاڑ پن برس رہا ہے۔ پیچھے کی دیوار میں مسجد کا دروازہ تھا، جو اب پتھروں میں دب گیا ہے۔ اسٹیج کے بائیں طرف کی دیوار کا پیچھے والا کونا ٹوٹا ہوا ہے۔ یہیں سے آدمی اندر آ سکتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی چھت سے ایک ٹوٹا ہوا فانوس لٹک رہا ہے۔

ابھی سورج نہیں نکلا پیچھے کی طرف اسٹیج کے دائیں کونے میں اونچے سے پتھر پر مجاور بیٹھا ہے۔ ہلکی سی روشنی اس کے چہرے کے ایک حصے کو نمایاں کرتی ہے۔ باقی اسٹیج اندھیرے میں چھپ گیا ہے۔

بہت سریلی اور دردناک آواز میں مجاور انشا کی غزل گا رہا ہے۔ سامنے جلتے ہوئے لوبان کے ہلکے ہلکے دھویں سے اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا سایہ مرتعش ہے۔ جسم پر ہری کفنی اور سر پر پیلا رومال بندھا ہے۔ غزل کے تاثر سے چہرے پر ایک نور ہے جس میں دلکشی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل نے فضا میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے، ایک مکمل سکوت کا عالم جیسے کائنات رک گئی ہو۔ ہر شے ذرّہ ذرّہ جیسے تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ہو۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

غزل پردہ اٹھنے سے پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر بعد پردہ اٹھتا ہے تو ہم پوری غزل سنتے ہیں۔ غزل ختم ہوتے ہی جیسے مجاور کے چہرے سے رونق کوچ کر جاتی ہے، مقطع کے بعد ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے سے میر صاحب اور میرزا صاحب بغل میں شطرنجی، مداریا، پان کا ڈبہ، بساط وغیرہ لئے ہوئے تلوار، خنجر، شیر پنجہ وغیرہ سے لیس، اٹکل پر چلتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ مجاور گھبرا کر اٹھ جاتا

ہے۔ کھٹکا ہوتے ہی دونوں چونک پڑتے ہیں۔

میر صاحب:۔ ہائیں۔

دونوں:۔ (بیک وقت) کون ہے؟

مجاور:۔ (خود بے حد گھبرایا ہوا) فرنگی!

میر صاحب:۔ مرزا؟

مرزا صاحب:۔ جی!

میر صاحب:۔ کون ہے؟

مرزا صاحب:۔ میں ہوں۔

مجاور:۔ کون؟

مرزا صاحب:۔ ... یہ ..... یہ میر صاحب قبلہ ..... یہ کون بولا؟

میر صاحب:۔ (کچھ سراسیمہ ہوکر) آپ کے کان بج رہے ہیں مرزا۔

مجاور:۔ (کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس بلائے ناگہانی سے کانپ اُٹھتا ہے) فرنگی!

میر صاحب:۔ آپ نے کچھ سنا؟

مرزا صاحب:۔ صدائے غیبی تھی!

میر صاحب:۔ لفظ یاد ہے آپ کو کیا تھا؟

مرزا صاحب:۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

میر صاحب:۔ فرنگی تو نہیں تھا۔

مرزا صاحب:۔فرنگی!

دونوں:۔فرنگی!

دونوں کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔فرنگی فرنگی کی آوازوں سے اسٹیج گرجت اٹھتا ہے۔ ہلکی ہلکی روشنی پڑھ رہی ہے جس میں یہ دیکھتے ہیں کہ میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں ۔پھرایک دوسرے کوفرنگی سمجھ کر دور بھاگ جاتے ہیں۔مجاور دیا سلائی سے ایک موم بتی جلاتا ہے اور موم بتی کی دھندلی روشنی میں ہمیں پہلی بار اسٹیج دکھائی دیتا ہے۔اس وقت میر صاحب اور مرزا صاحب اسٹیج کے دومختلف گوشوں سے تلواریں لئے ایک دوسرے کی طرف پینترے بدلتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔مجاور کی دھندلی شکل دیکھ کر پھر ایک بار گھبرا جاتے ہیں،روشنی کچھ اور بڑھتی ہے۔دونوں قریب جا کر مجاور کا جائزہ لیتے ہیں۔جب اطمینان ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں۔

مرزا صاحب :۔(سانس اب تک اکھڑی ہوئی ہے) لاحول ولا قوۃ ! کیا میر صاحب،خواہ مخواہ ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔

میر صاحب :۔(اسی قدر بدحواسی میں) اماں' ہٹو بھی۔اپنی کہو،حواس ٹھکانے نہ تھے۔

مرزا صاحب:۔(مجاور سے)تم کون ہو؟

مجاور:۔آداب بجالاتا ہوں حضور!

مرزا صاحب:۔آداب۔

میر صاحب:۔میں پہلے ہی کہتا تھا، کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈیں۔یہ جگہ اچھی نہیں۔

مرزا صاحب:۔آپ کہیں تو قیصر باغ چلیں؟

میر صاحب:۔میرا یہ مطلب نہ تھا۔

مرزا صاحب:۔اور؟

میر صاحب:۔ویرانوں میں بھی معقول ویرانے ہوتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔حضور، ویرانوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ویرانوں میں یا اُلّو بستے ہیں اور یا آپ جیسے انسان؟

میر صاحب:۔حضّت!

مرزا صاحب:۔حجت نہ کیجئے۔اب آیئے بساط جماتے ہیں۔

میر صاحب:۔اجی بساط جائے جہنم میں۔آپ تو یوں بوکھلا پڑتے ہیں۔زری سی بات پر جیسے جانے کہاں کی بلا

نازل ہوگئی۔دوسرے کو بھی پریشان کردیں۔

مرزا صاحب:۔(ابھی تک گھبرائے ہوئے ہیں) تو بازی نہیں جمے گی؟

میر صاحب:۔جمے گی کیوں نہیں۔زری ہوش تو ٹھکانے لگ جائیں۔

مرزا صاحب:۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟ (مجاور کی طرف اشارہ کرکے) ان

ذات شریف کے سب کرتوت ہیں ۔ پیروں میں آتے ہیں کمبخت!

مجاور:۔ بندہ پرور واللہ ہے، یہ دیکھئے۔ میں سمجھا فرنگی...

میر صاحب۔(یکا یک پھر خوفزدہ ہوکر) فرنگی؟

مرزا صاحب۔(گھبرائے ہوئے) میر صاحب!

میر صاحب۔فرنگی!

مرزا صاحب۔فرنگی؟......کہاں ہے فرنگی؟

میر صاحب۔(مجاور سے) بولتے کیوں نہیں؟

مرزا صاحب:۔کہاں ہے فرنگی۔ بتاؤ؟

مجاور:۔واللہ ہے۔فرنگی آچکا ہے حضور!

دونوں:۔(ایک ساتھ) کدھر؟ (اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد)

مرزا صاحب:۔(یکا یک مجاور کے سامنے ڈٹ کر) تم کون ہو جی؟

میر صاحب:۔(مرزا کے پیچھے سائے کی طرح ہیں اور آوازِ بازگشت کی طرح کون ہو جی؟

مرزا صاحب:۔(ایک خیال سے یکا یک سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں) جاسوس تو نہیں ہو؟ (میر صاحب چیخ مار کر مرزا سے لپٹ جاتے ہیں) میر صاحب، ہوش کے ناخن لیجئے۔

میر صاحب:۔(جھنجھلا کر) آپ اپنی سوچئے حضّت۔

مرزا صاحب:۔ بھلا یہ آدمی آپ کو فرنگی نظر آتا ہے؟

میر صاحب:۔ کہیں سرکار میں طلبی ہوئی تو مارے گئے۔

مرزا صاحب:۔ (مجاور سے) تم اگر جاسوس ہو اور ہماری تلاش میں کالے کوسوں سے آئے ہو تو ہم کہے دیتے ہیں،

ہمیں سپاہی بننے سے صاف انکار ہے۔ جا کر حضور والا سے کہہ دو۔

میر صاحب:۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ؟

مرزا صاحب :۔خاموش رہئے میر صاحب! (مجاور سے) سمجھے؟ آخر سپاہیوں کی ضرورت ہے تو سارا لکھنؤ پڑا

ہے۔ جب فرنگی آئیگا تو دیکھا جائے گا۔ ہم بھی اپنی سی کر گزریں گے۔ ہم دنوں کا یہی پیغام ہے، اب جاؤ۔

اب زری آپ بھی اپنے دل پر قابو رکھئے میر صاحب!

مجاور:۔ یہ دیکھئے میں مجاور ہوں حضور والا (یہ سنتے ہی دونوں بہادر بن جاتے ہیں اور سینہ تان کر اکڑ جاتے ہیں) مرزا صاحب:۔ اچھا۔ تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس ویرانے میں۔

مجاور:۔ اے حضور، یہ مسجد ہے غریب پرور۔

مرزا صاحب:۔ کبھی رہی ہوگی مسجد۔ اب تو اس میں چمگاڈریں اذان دیتی ہیں اور ابابیل نماز ادا کرتی ہیں۔

مجاور:۔واللہ ہے، کبھی کی دی ہوئی اذانوں کی آوازیں اب تک اس میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔حضور یہ دیکھئے اس مسجد میں بہت سکون ہے۔ یہاں رہ کر روح کو بڑی تسکین ہوتی ہے۔

مرزا صاحب: ۔ یہاں مسجد اللہ کے گھر کو کہتے ہیں۔ اسے ویرانہ کہئے تو زیادہ مناسب ہے۔مسکن بوم وزاغ ۔!

مجاور:۔اے پیرومرشد۔واللہ ہے، یہ دیکھے۔ یہ بھی کبھی اللہ کا گھر تھا۔اس کی شان کا مظہر ہے۔اب اس کی یادگار باقی ہے، واللہ۔

مرزا صاحب:۔تو میاں، یہاں نماز پڑھا کرو۔تم تو یہاں اونگھتے رہتے ہو معلوم ہوتا ہے۔

مجاور:۔واللہ ہے یہ دیکھئے۔اذان سن کر لبیک کہنے والے ہی باقی نہ رہے حضور۔

مرزا صاحب:۔تو ہم کیا کریں؟

میر صاحب:۔آپ کیا کریں گے مرزا؟ خدا سے خوف کھایئے۔ایسی باتیں نہ کیجئے۔

مرزا صاحب:۔آپ بات بات پر منبر پر نہ کھڑے ہو جایا کیجئے۔حضت طبیعت زچ ہوگئی آپ کے وعظ سن کر۔اللہ نے بندے کو فعل پر اختیار دیا ہے۔عاقبت میں اپنی اپنی بھگت لیں گے۔آپ کون نصیحت فضیحت کرنے والے۔

میر صاحب:۔ میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ خدا سے خوف کھایئے۔ آپ تو سچ مچ وعظ فرمانے کھڑے ہو گئے۔

مرزا صاحب:۔ خطا ہوئی حضور بخش دیجئے۔ آج آپ صبح سے بدمزاجی کر رہے ہیں۔ جولا ہے کا غصہ اور ڈاڑھی پر اتارا جا رہا ہے۔ ہمیں رہ گئے تھے بیوی کا نزلہ اتارنے کے لئے۔

میر صاحب:۔ بیوی کا نزلہ کیا معنی؟ آپ آئے ہیں گھر سے لڑ کر!

مرزا صاحب:۔ یہاں پر تو آپ ہی لڑ رہے ہیں۔ میر صاحب، (مجاور کو مسکراتا دیکھ کر) تم کھڑے کیا دانت دکھا رہے ہو؟

مجاور:۔ غریب پرور!

میر صاحب:۔ زری یہ فرش صاف کرو۔ (مجاور فرش پر جھاڑو دیتا ہے)

مرزا صاحب:۔ یہاں پڑوس میں کوئی رہتا تو نہیں ہے؟

مجاور:۔ (جھاڑو دیتے ہوئے) یہ دیکھئے ویرانی ہی کا پڑوس ہے سرکار۔ اور واللہ ہے ویرانی ہی کا یہاں مسکن۔

مرزا صاحب:۔ سیدھی بات کرنی نہیں آتی؟ طنز کرتے ہو ہم پر؟

مجاور:۔ (جھاڑو چھوڑ کر ہاتھ جوڑ لیتا ہے) اے حضور، آپ کی جوتیاں اٹھا کر زندہ رہتے ہیں۔ ہماری کیا مجال خداوند۔ واللہ ہے میں نے تو سچ عرض کیا۔ یہ دیکھئے گستاخی ہوئی ہو تو بخش دیجئے۔

مرزا صاحب:۔ یہاں ابھی کون گا رہا تھا؟

مجاور:۔ بندۂ درگاہ- ذرّہ نواز!

میر صاحب:۔بس اب مسجدوں میں بیٹھے لوگ گایا کرتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔کہاں سے آئے ہو؟

مجاور:۔فیض آباد کا رہنے والا ہوں حضور۔ مدت سے رودلی......

میر صاحب:۔ یہاں کیا کر رہے تھے؟

مجاور۔ رودلی ہی میں کیا کرتا بندہ پرور۔ یہ دیکھئے، ابھی کچھ دنوں سے لکھنؤ آ گیا ہوں۔یہیں پڑا رہتا ہوں کس قدر خطرناک ویرانہ ہے حضور۔ بڑا بڑا قہری۔ایک سے ایک اژدہ۔اسی جگہ پایا جاتا ہے واللہ۔

میر صاحب- واللہ؟

مجاور۔ واللہ حضور

میر صاحب۔مرزا؟

مرزا صاحب۔آپ بہت بزدل ہیں میر صاحب۔ واللہ (مجاور سے) لکھنؤ میں کیا کرتے ہو۔

مجاور۔ کچھ نہیں کرتا حضور واللہ۔ ردولی کے پاس سیدامیر علی کی درگاہ ہے اس کی نگہداشت کرتا تھا۔

میر صاحب۔کون سیدامیر علی؟ سیدامیر علی شہید؟

مجاور۔ جی ہاں حضور، وہی۔

مرزا صاحب۔ سید امیر علی مجاہد؟

مجاور۔ جی ہاں حضور۔ یہ دیکھئے جنہوں نے فیض آباد میں جہاد شروع کیا تھا۔ مسجد بابری کے منہدم ہو جانے کے بعد انھیں کی درگاہ کا مجاور ہوں حضور واللہ۔

مرزا صاحب۔ (جو بے خیالی میں جھاڑو کے سامنے آ گئے تھے بھنّا کر) دیکھ کے دو میاں جھاڑو، آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟ منوں خاک پھیپھڑوں میں اتار دی کمبخت نے!

مجاور۔ اے حضور واللہ ہے بھول ہوئی۔

میر صاحب۔ میاں زرا چلم بھرنا (بساط بچھاتے ہوئے) کیسا زمانہ آ رہا ہے مرزا، کہ آج خانہ خدا پر حملہ ہوتا ہے اور

ابھی کل تک ہماری حکومت کی سب کے دلوں میں دھاک تھی۔

مجاور۔ اے حضور سنا ہے واللہ ہے کہ ان فرنگیوں کی لگائی ہوئی آگ تھی۔ یہ دیکھئے انھیں نے لوگوں کو اکسایا تھا۔

واللہ ہے مسجد کھدوا کے رکھ دی۔

میر صاحب۔ بکواس ہے۔ فرنگیوں کو مسجدیں مسمار کرنے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام نہ تھا۔

مجاور۔ نہ جانے کیوں ایسا کیا ہوگا۔ حضور۔

میر صاب۔ کسی پاگل کی اڑائی ہوئی روایت ہے میاں؟

مجاور۔ جھوٹ ہوگا حضور۔ بھلا آپ کیسے غلطی کر سکتے ہیں۔ واللہ (جھاڑو دے چکنے کے بعد) اے حضور دست عنائی کا صدقہ کچھ مل جاتا خانہ زادوں کو۔

(شطرنج بچھا کر دونوں صاحبان جم جاتے ہیں اور بساط بچھاتے ہیں)

مرزا صاب۔ میر صاحب مگر مغل شہنشاہوں سے لے کر آج تک ہماری تاریخ میں ہندو مسلم فساد کی مثال نہیں ملتی۔ اور انگریزی سلطنت میں ایک سال کے اندر اندر چاروں طرف سر پھٹول ہوا ہے۔ الہ آباد، دہلی، فیض آباد اور جانے کہاں کہاں۔ آخر اس کا کیا مطلب۔ سچ کہتا ہے یہ مردود۔ ہو نہ ہو یہ تعصب کا بیج فرنگی ہی نے بویا ہے۔ مجھے تو شک ہے۔ مہرہ بڑھئے۔

مجاور۔ (جو پیچھے ہاتھ باندھے اب تک کھڑا ہے) پیرو مرشد۔ آپ ہی کے جوتیوں کے طفیل زندہ ہیں۔ یہ دیکھئے واللہ کچھ عنایت ہو جاتا۔ پیر دستگیر کا صدقہ۔

میر صاحب۔ (مہرہ بڑھتے ہوئے) تو پھر آپ کے قول کے مطابق جہاد فرنگیوں کے خلاف ہونا چاہئے تھا نہ کہ ہندوؤں کے خلاف۔

مرزا صاحب۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اس کے لئے کسی مستند مولوی سے فتوی لینے کی ضرورت ہے اور ہم ٹھہرے رندِ خراباتی۔!

مجاور۔ اے حضور واللہ ہے۔

میر صاحب۔ آپ کا خیال ہے سید امیر علی شہید مستند مولوی نہ تھے۔

مرزا صاحب۔ میں کب کہتا ہوں۔ مگر انھیں کب علم تھا کہ فتنے کی جڑ فرنگی تھے؟

یہ دیکھئے۔ علم ہوتا تو واللہ ہے وہ ہندو کے خلاف ہرگز نہیں، فرنگیوں کے خلاف جہاد کرتے۔ اے حضور سر مبارک کے صدقے۔ کچھ انعام......

میر صاحب۔ مگر آپ کو تو علم ہے۔ آپ کیجئے فرنگیوں کے خلاف جہاد۔

مرزا صاحب۔ وقت آنے دیجئے۔

میر صاحب۔ وقت اور کب آئے گا۔

مرزا صاحب۔ ذری فتویٰ تو حاصل کرلوں کسی مستند مولوی سے۔

مجاور۔ اے حضور، پھوٹی کوڑی کیسے میں نہیں واللہ ہے۔ یہ دیکھئے۔......

مرزا صاحب۔ کیوں بھئی تم اس لئے فرنگی فرنگی چیخ رہے تھے میاں؟

مجاور۔ جی نہیں حضور واللہ۔ میں نے تو آج یہ سنا ہے کہ فرنگی کی فوج بڑھ رہی ہے۔ اے حضور دیکھے واللہ۔

مرزا صاحب۔ اماں فرنگی کی فوج بڑھ رہی ہے چہ معنی دارد؟ کدھر بڑھ رہی ہے اس کی فوجی تو ہر طرف جہاں بڑھنا تھا، بڑھ چکی۔ اب اور کیا بڑھے گی!

میر صاحب۔ بھنگ پی رکھی ہے کیا؟

مرزا صاحب۔ چہرہ مبارک سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اچھے خاصے چانڈو باز ہیں۔

یرصاحب۔ ہم سے بتادو یاافیم کھاتے ہو۔

مجاور۔کبھی کبھی نشہ کرلیتا ہوں سرکار۔

میر صاحب۔شاباش

مجاور۔واللہ ہے یہ دیکھئے حضور، اسی لئے تو استدعا ہے کہ بندۂ درگاہ کو کچھ......

مرزا صاحبہ۔ہم سمجھتے ہیں کہ نشہ ایک عیاشی ہے جسے صرف رئیس کر سکتے ہیں۔

میر صاحب۔آج لکھنؤ میں کون اس عیاشی سے محروم ہے۔

مرزا صاحب(گاتے ہوئے)   پیا پیارے اتنی عرج موری مان

پیا پیارے عرج موری مان پیا پارے

مجاور۔اے حضور واللہ یہ دیکھئے کئی دن ہو گئے نشہ کئے ہوئے۔

مرزا صاحب۔اتنی عرج موری مان

میر صاحب۔بھئی بہت حسین دُھن ہے۔

مجاور۔دریں چہ شک کچھ تھوڑے سے پیسے خادم کو مل جاتے حضور۔

مرزا صاحب ۔ پیا پیارے اتنی عرج ..... واللہ کیا دھنیں نکالی ہیں۔ پیا پیارے جان عالم نے۔

مجاہور۔دریں چہ شک اے حضور واللہ ہے یہ دیکھئے.....

مرزا صاحب ۔ یہ کیا بیچ بیچ میں۔اسے حضور داللہ ہے یہ دیکھنے کی ٹر لگا رکھی ہے

میاں، بہت بدلگام معلوم ہوتا ہے میر صاحب یہ مردود؟

مجاور۔ قطع کلام کی معافی مانگتا ہوں حضور، فدوی عرض کر رہا تھا کہ ابھی کل حضور جان عالم کے دربار میں محض رقص گرم تھی۔ بندہ درگاہ بھی ایک گوشہ میں دبکا بیٹھا تھا۔ رقاصہ اسی حسین کہ بن گہنے چاند کو شرمائے۔ زلف چلیپا وہ کہ جس کی یاد سے کلیجے پر سانپ لوٹے۔ کمر نازک ایسی کہ رگِ گل سے زیادہ نازک۔ لبوں پر پان کی تحریر جیسے غنچے کھل کھلا اٹھیں۔ تبسم ایسا جیسے کوئی پھول کے سینے میں موتی بھر دے۔ قدم وہ سبک سار کہ دیکھ کر زہرہ کے پاؤں میں موچ آئے۔ میرا دل بُھر بُھرانے لگا۔ ہائے پاؤں چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔

مرزا صاحب۔ ماشاءاللہ آپ کو تو شاعر ہونا چاہئے تھا۔ مجاور کس مسخرے نے بنایا۔

مجاور۔ آداب بجالاتا ہوں۔

مرزا صاب۔ چال چلئے میر صاحب۔

میر صاحب:۔ اماں ذری ٹھہریئے چل لیں گے چال۔ ایسی کیا جلدی ہے۔

مرزا صاب۔ گھنٹے بھر سے انتظار کر رہا ہوں۔

میر صاحب-زری سوچنے دیجئے۔ (مجاور سے) ہاں میاں۔!

مجاور۔ شہید حسرت آغوش تھا، بیٹھا اپنے قتل کا تماشا دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

از کجامی آئی اے سرمستِ خوبی محوِناز عطر آگیں تا بہ دامن عنبر افشان تا کمر

میر صاب۔ واہ واہ

مجاور۔ طبلے کی گمک پر سر دھن رہا تھا۔ اے حضور واللہ ہے یہاں کے طبلچیوں کے ہاتھ کی قسم کھانا چاہئے۔ کیا نپا تلا ہاتھ ہوتا ہے، کیا جچی ہوئی تھاپ کہ دل نکل پڑے میر صاحب۔ یہ تو اچھے خاصے بھانڈ ہیں بھئی۔ ان کا مقام تو دربار میں ہے۔ لیجئے مرزا بڑھئے۔

مرزا صاحب-کشت۔ ہاں بھئی پھر کیا ہوا؟

مجاور۔ ہوتا کیا حضور چاروں طرف سر ہل رہے تھے اور صدائے تحسین و آفریں بلند تھی۔ کیا نرت ہے۔ کیا بھاؤ ہے، اے سبحان اللہ: زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

واہ واہ۔ ذری دست حنائی کا بوسہ دے دیجئے کہ ہم نیم بسمل ہوں۔ اماں بوسہ کیا معنی اجی ذرا ترچھی نظر ایک نگاہ غلط انداز سے بس دیکھ لیجئے۔ عاشق جاں بلب کی طرف کہ روح پرواز کر جائے لاحول ولا۔ کیا بات کہی ہے

ٹچّوں کی سی۔ یوں ہی دو گھڑی اور رقص کئے جایئے، بس جان نکل جائے گی ہماری، قسم خدا کی۔

مرزا صاحب۔ میاں واللہ۔ یہاں تو محض تمھاری باتوں سے جان پر بن آئی ہے۔

مجاور۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ بس حضور، اتنے میں حضور جان علم اختر پیا نے ہاتھ کے ایک اشارے سے اس رقاصہ برق رفتار کو روکا اور وہیں مسند پر بیٹھے بیٹھے بانہوں کی ایک ہلکی سی نازک جنبش کے ساتھ کہا کہ یوں نہیں یوں۔

مرزا صاحب:۔اے سبحان اللہ

میر صاحب: کیا کہنے ہیں رنگیلے پیا جان عالم کے۔

مجاور۔:قسم جناب امیر کی حضور، واللہ ہے کیا توڑ الیا تھا حضور پر نور ہی کی ایجاد تھی یہ دیکھئے ساری محفل تعریفوں کے شور سے گونج اٹھی۔ایک نے کہا کس برتے پر فرنگی ہم سے مقابلہ کرنے چلے ہیں۔دوسرا بولا صحیح فرمایا، سات سمندر پار کے بندر لکھنؤ کے سورماؤں سے ٹکر لینے چلے ہیں۔ واللہ ہے تو پھر میں بھی تاب نہ لا سکا اور دست بدستہ خدمت اقدس میں عرض کیا ''حضور وہ مثل تو آپ نے سنی ہوگی کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف رخ کرتا ہے اور فرنگی کی جب موت آتی ہے۔۔۔۔۔۔

مرزا صاحب:۔تو وہ لکھنو کی طرف آتا ہے۔بھئی واہ واہ۔

میر صاحب۔کیا کہنے ہیں۔

مجاور:۔بس حضور قسم ہے جناب باری کی واللہ ہے حضور جان عالم کو یہ بات اس قدر پسند آئی کہ درشہوار کا ہار جو زیب گلوئے مبارک تھا، فوراً اتارا اور ہاتھ بڑھا کر میری گود میں ڈال دیا۔

مرزا صاحب:۔ سرورِ خسروان عالم ہے سچ تو یہ ہے کہ جان عالم ہے

میر صاحب:۔بات بھی تو تم نے لاکھوں کی کہی تھی۔

مرزا صاحب:۔ بے شک

مجاور:۔ حضور اللہ ہے یہ دیکھئے کہ بندۂ درگاہ کس حال کو پہنچ گیا ہے۔ قسم ہے جو ایک کوڑی زہر کھانے کے لئے بھی کیسے میں ہو۔ آج دس دن گئے چنیا بیگم کی شکل نہیں دیکھی۔ اگر چھ پیسے فدوی کو عنایت ہوتے تو افیم کی ایک چسکی لگا تا اور حضور کو تا زندگی دعائیں دیتا۔

میر صاحب:۔ وہ دُرِّ شہوار کا ہار چٹ کر گئے آپ؟

مجاور:۔ اے حضور واللہ ہے یہ دیکھئے کہ کسے کیسے چوٹٹوں اور لفنگوں کی رسائی ہے حضور جان علم کے دربار میں...

میر صاحب:۔ یہ تو تمھاری باتوں سے ثابت ہو رہا ہے۔

مجاور:۔ ابا جان کی قسم، ہار لے کر دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک اُچکّے اٹھائی گیرے نے ہاتھ کی وہ صفائی دکھائی۔ مصافحہ کرتے وقت ہار اس کمال سے اچک لیا گیا کہ مجھے علم ہی نہیں۔ گھر پہنچا تو ہار نہ دارد۔ لکھنؤ کے چوٹٹے، آنکھ سے کاجل نکال لیں اور پتہ نہ چلے۔

مرزا صاحب:۔ بھئی کمال کے آدمی ہو۔ ڈبیا میں بند کر کے رکھنے کے قابل۔ لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ (مجاور کو کچھ پیسے دیتے ہیں، مجاور جھک جھک کر سلام کرتا ہوا الٹے پاؤں دروازے کی طرف جاتا ہے)

مجاور:۔ آداب عرض کرتا ہوں حضور۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

میرصاحب:۔آپ نے اس کی بات کا یقین کرلیا ہے؟

مرزا صاحب:۔ کیوں نہ کرتا۔جھوٹ بھلا یہ کیوں کہیں گے (مجاور) کیوں حضت ۔

مجاور:۔ (جاتے جاتے دروازے کے پاس رک کر) جھوٹا کہنے والے کے منہ پر دس...... لاحول ولاقوۃ۔حضور واللہ ہے جھوٹ کہنے والے کے منہ پر دس جوتے ۔ آداب بجالاتا ہوں (جھک جھک کر سلام کرتا ہوا نکل جاتا ہے)

میرصاحب:۔(چال چلتے ہوئے) اس بات پر آپ کو انعام ہرگز نہ دینا چاہئے تھا

مرزا صاحب:۔( ) آدمی اچھا ہے اور ہم ٹھہرے شریف پرور۔

میرصاحب:۔( ) شریف پرور نہیں قبلہ۔آپ اچھے خاصے پاجی پرست ہیں

مرزا صاحب:۔( ) کوئی مانگے اور میں نہ دوں۔ بڑی ہیٹی ہوتی حضت میں زہر کھا کر مرجاتا۔

میرصاحب:۔( ) بے پر کی اڑا رہا تھا تو ہر بات کو آمنّا وصدقنّا کہہ کر تسلیم کرلیتے ہیں۔

مرزا۔صاحب:۔( ) یہ کشت اور مات

میرصاحب:۔جی۔

مرزا صاحب:-جی ہاں۔(میر صاحب اپنی شکست پر غور کررہے ہیں)

مرزا صاحب:۔سوچ لیجئے۔خوب سوچ لیجئے۔آج کی بازی بہت بری رہی آپ کے لئے کیوں! کیوں میر صاحب؟ اجی کچھ ہوں ہاں کیجئے۔دم گھٹا جاتا ہے واللہ

میر صاحب:۔آپ تو منھ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں،اے کچھ بولئے نا بھئی واہ وا مزا آ گیا۔کیا سوچ رہے ہیں حضت؟ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ڈال دیجئے ہتھیار؟

میر صاحب:۔اچھا صاحب۔

مرزا صاحب:۔جی۔

میر صاحب:۔(مہرے جماتے ہوئے) آیئے دوسری بازی جم جائے۔

مرزا صاحب:۔(ʺ) جیسی آپ کی مرضی (دوسری بازی جمتی ہے) بھئی لطف گیا:۔

میر صاحب:۔۔اب کی دیکھ لیتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔۔(چال چلتے ہوئے) آجایئے بسم اللہ۔

میر صاحب:۔(ʺ)اتنی تیزی نہ دکھایئے

مرزا صاحب:۔(ʺ)یہی ہے ہمارا فتح کا راز۔ایسی قلعہ بندی آپ کرلیں تو ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں۔

میر صاحب:۔ڈینگ نہ ماریئے حضرت-غرور کا سر نیچا۔

مرزا صاحب:۔اماں آج تک تو نیچا نہ کر سکے۔

میر صاحب:۔دیر نہ لگے گی۔

مرزا صاحب، پیا پیارے اتنی عرج موری مان ... پیا پیارے......(باہر کھٹکا ہوتا

ہے دونوں چونک پڑتے ہیں) کون ہے۔(ایک کسان داخل ہوتا ہے غصہ سے بھرا ہوا، منہ ہی منہ میں کسی کو گالی دے رہا ہے)

کسان :- چمر گدھ۔

دونوں۔ ہائیں۔کون ہو تم ؟

کسان :۔(دم لینے کے بعد) ان کا ناس جائے۔

مرزا صاحب :۔ کیوں بے، یہ کسے منھ بھر بھر کے کوس رہا ہے؟

کسان :۔ گدھ- چمر گدھ۔

میر صاحب :۔ کہیں آپ کے مجاور صاحب کو تو نہیں سنا رہا ہے؟

مرزا صاحب :۔ اِدھر توجہ کیجیے حضور کِشت ۔

میر صاحب :۔ آنکھوں میں دھول نہ جھونکیے یہ کِشت کیسی ؟

مرزا صاحب :۔ روئیے مت، شکست کا مقابلہ بہادروں کی طرح کیجیے ۔

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں .... شہ بچیئے (میر صاحب مہرہ بڑھتے ہیں)

کسان :۔ سسرن کا ناس جائے ۔ چمر گدھ! (مرزا صاحب ہنس کر رخ اُٹھا لیتے ہیں)

میر صاحب :۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ بڈھا آج پاگل بنا کر چھوڑے گا ہمیں دیکھئے نا دو زخی نے رخ پٹوا دیا۔

مرزا صاحب:۔ بدحواس آپ ہوئے جاتے ہیں اور غریب کو مفت میں بدنام کرتے ہیں۔ اب وزیر بچیئے۔

کسان:۔(باہر دیکھتے ہوئے) اب وزیر بچیئے نہ بادساہ۔

میر صاحب:۔(ڈرتے ڈرتے وزیر بچتے ہیں) احمق کہیں کا!

مرزا صاحب:۔ بڑھا سچ کہتا ہے۔ وزیر تو گیا۔ بادشاہ بھی اب تب کے مہمان ہیں (وزیر پیٹ کر) رخ کے منہ پر رکھ دیا آپ نے بھی تو بدنصیب کو۔

کسان:۔ چمرگدھ (مرزا صاحب مہرہ لپٹ لیتے ہیں)

میر صاحب:۔(جھنجھلا کر) چُپ رہ مردود۔

مرزا صاحب:۔ چلیئے باتیں نہ بنایئے (میر صاحب مہرہ بڑھتے ہیں مرزا فوراً اس کا جواب پیش کر دیتے ہیں میر صاحب اچک کر کھڑے ہو جاتے ہیں) اب کہاں چلے حضت یہ ہے میدانِ کارزار۔ پیٹھ نہ موڑیئے، کشت بچیئے۔

کسان:۔ ان کا ناس جائے پھر نگین کا۔

میر صاحب:۔ ادھر آ بے حرامزادے۔

نا صاحب:۔ اماں چلیئے۔

کسان:۔(پاس آ کر) کا...... ہے؟

میر صاحب:۔ غرّاتا ہے مردک؟

مرزا صاحب۔ اتراشہنا مردک نام۔

میر صاحب:۔آپ نے سنی اس گردن زدنی کی بات چیت؟

مرزا صاحب:۔سنی۔

میر صاحب:۔کہنے لگا،کا ہے۔اُجڈ کہیں کا۔گستاخ۔

مرزا صاحب:۔اس کا عمل اس کے ساتھ۔آپ اپنی عاقبت کی فکر کیجئے۔

میر صاحب:۔ادب سلیقہ کچھ نہیں سیکھا کمبختوں نے۔حضور سرکار سب چھپر پر،اور کہنے لگا،کا ہے۔

کسان:۔حضور،اب کیہ کا حجور رہی اور کیہ کا سرکار؟ حجور رد گئے اور سرکار رد گئے سرکار۔

مرزا صاحب:۔آخر ہوا کیا بڑے میاں؟ کچھ بتاؤ گے یا بس منہ ہی منہ میں بکے جاؤ گے؟

کسان:۔سہر والے اپنے بال بچن کے لے کے گاؤں کی اور بھاگت رہیں۔ مالک!

میر صاحب:۔اس لئے ہم صبح سے ہی یہاں آ گئے تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ فرنگیوں کی خبر سن کر ہم بھی بھاگ گئے۔

مرزا صاحب:۔آپ بھاگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں؟

کسان:۔ہم کہر بھاگ کے جان سرکار؟ ہمار مایا پوتھی تو ساری جمینے ماں ہے جمین سسر چھوڑ بھاگے تو کسان کہر جائے۔

میر صاحب:۔بکتا ہے مردود،نہ جانے کیا اول فول......

کسان:۔ہم بھاگ جائی ملا جمین تو نا ہیں بھاگ سکت ہے حجو ر! دھرتی تو پچلی جات ہےاور کھون ماں نہات ہے۔

میر صاحب:۔سٹھیا گیا ہے بڈھا۔

کسان:۔مل دھرتی کبھونا ہیں مرت ہے۔اُو تو ہر بیر جی اُٹھت ہے سرکار ۔۔۔۔۔

مرزا صاحب:۔واللہ بڑا بد مذاق ہے یہ بڈھا۔ابے بڑا گستاخ ہےتو؟

کسان:۔(ہاتھ جوڑ کر) بھول چوک ما پھ نواب صاحب!

مرزا صاحب:۔چھوڑیئے۔کون جاہلوں کے ساتھ سر کھپائے! اپنے بادشاہ کی خبر لیجئے میر صاحب۔

کسان:۔جن کا نہ سرم نہ لہاج،اوکا خبر لہیں (دروازے کی طرف جا کر)

میر صاحب:۔کیا کہا؟

مرزا صاحب:۔(کسان سے متوجہ ہو کر) پھر کچھ فرمایا آپ نے۔

میر صاحب:۔نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا بک رہا ہے۔

مرزا صاحب:۔کہہ رہا ہوگا چمر گدھ۔بس اس ایک لفظ کے سوا م اسے آتا ہی کیا ہے۔

کسان:۔چمر گدھ۔ان کا ناس جائے پھرنگین کا۔

مرزا صاحب:۔ارے بابا تم اور بوکھلائے دے رہے ہو ....ارے ہم کیا کم

آزردہ ہیں؟

میر صاحب:۔ ہمارے کلیجے پر کیا چھریاں نہیں چل رہی ہیں؟

مرزا صاحب:۔ مگر......گزشت وقت دوا نوبت دعا باقی است

میر صاحب:۔ لکھنو کے جانب ہونے کی امید ہوتی تو ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے؟

مرزا صاحب:۔ ان خبیث فرنگیوں سے مقابلہ کرنے کا خیال ہی حماقت ہے۔ کیوں میر صاحب؟

میر صاحب:۔ اور کیا قبلہ گولی سے تو مردود بات کرتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔ کشت۔ یہ تو نہ کہو میر صاحب کوئی سلیقہ کا آدمی ہو تو یہ اچھی خاصی بات کر لیتے ہیں (چال سوچتے ہوے) کیوں؟

میر صاحب:۔ کیا خیال ہے آپ کا۔......مگر سنا ہے یہ قدر دان تو اعلیٰ درجے کے ہیں......اگر .... (ایک دم چپ ہو جاتے ہیں)

میر صاحب:۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔

مرزا صاحب:۔ میں کہہ رہا تھا حضور، اگر فرنگیوں کو پتہ چل گیا تو بس۔

میر صاحب:۔ (گھبرا کر) وہ کسی بات کا پتہ؟

مرزا صاحب۔ آپ ٹھہرے ماہرِ فن کہیں آپ کے قدر دان اُٹھا کر ملکہ معظّمہ برطانیہ کے خاص الخاص شطرنج باز کی حیثیت سے آپ کو لندن .... یہ کشت۔

میر صاحب:۔ دیکھنے میں تو بڑے بد ذوق معلوم ہوتے ہیں یہ فرنگی۔کیا شطرنج سے بھی شوق رکھتے ہیں یہ؟

مرزا صاحب:۔استاد ہیں استاد، دیکھتے نہیں حضور، مہاجنی کرتے کرتے حکومت کرنے لگے کیا بساط بچھائی ہے......کشت پر کشت ...مات پر بات (خوشی سے بڑے زور سے زانو پر ہاتھ مارتے ہیں۔باہر رفتہ رفتہ شور بڑھ رہا ہے)

میر صاحب:۔کیا ہوا؟

مرزا صاحب:۔بات ہونے والی ہے حضور،اور ایک۔کشت بچئے۔

میر صاحب:۔آپ تو یوں چہکے جیسے مات ہو ہی گئی ہو!

مرزا صاحب:۔صبر کیجئے۔بس اب ہوا ہی چاہتی ہے۔

کسان:۔چمر گدھ–

میر صاحب:۔واللہ اگر اس ملعون کی ضعیفی کا خیال نہ ہوتا تو قسم پنجتن پاک کی،ابھی تلوار سے دو ٹکڑے کر دیتا۔

کسان:۔ناس جائے۔

میر صاحب:۔آئے حواس گم کر دیتا ہے، بڑا ہی کوڑھ مغز ہے یہ بڈھا کھوسٹ، ارے میاں اللہ اللہ کرو۔ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو۔

کسان:۔اللہ ہے کا تو پکار ہیں سرکار اور کون سنتا ہے؟ (شور بڑھتا ہے)

میر صاحب:۔یہ شور کیسا؟ زری دیکھا چاہئے (اٹھ کر جانے لگتے ہیں)

مرزا صاحب:۔(ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) ادھر کشت بچئے حضور۔

میر صاحب:۔یہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔

مرزا صاحب:۔اجی آپ کے تو بیٹھے بیٹھے کان بجنے لگتے ہیں۔

میر صاحب:۔وہ چلی۔

مرزا صاحب:۔کیا چلی قبلہ؟

میر صاحب:۔گولی .... فرنگی کی گولی!

مرزا صاحب:۔اجی آپ تو خواہ مخواہ بدحواس ہوئے جاتے ہیں۔ مالیخولیا ہوا ہے آپ کو نہ گولی نہ وولی۔اور آپ ہیں کہ پھد کے جاتے ہیں (مجاور کہیں سے الٹے پاؤں بھاگ کر آیا ہے۔ ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے اور ہڑ بڑا کر گر جاتا ہے۔مرزا بھی اپنی جگہ پورے پُھدک پڑتے ہیں۔)

مجاور:۔ہات تیری فرنگی کی دم میں نمدا۔

میر صاحب:۔کیسا طوفان بے تمیزی ہے نشے میں کسی سے جھگڑا کر آئے ہونگے۔

مجاور:۔حضور-فرنگی۔

دونوں:۔پھر دہی فرنگی؟

مجاور:۔اے حضور داللہ ہے،فرنگی آ گیا۔

میر صاحب:۔تمھیں قرآن کی قسم؟

مجاور:۔اے حضور واللہ ہے۔آپ کا نمک خوار ہوں۔جھوٹ کہوں تو خانہ زاد کا وہی

حشر کیجئے جو فرنگی آپ کا کریں گے۔

میر صاحب:۔کیا؟

مجاور:۔اے حضور۔لاحول ولا۔واللہ ہے میرا مطلب یہ نہ تھا یہ دیکھئے یہ تھا کہ اگر فرنگی نہ آ رہے ہوں تو میرا وہی انجام ہو جو فرنگیوں کے طفیل لکھنؤ کا ہو گا۔

مرزا صاحب:۔(بیٹھ جاتے ہیں) بکتا ہے۔

مجاور:۔اے حضور اللہ ہے یہ دیکھئے نشہ کرنے سے پہلے ہی سب نشہ ہرن ہو گیا۔ لشکر جیسے ٹڈی دل۔گرد آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔بادل کی طرح جھوم کر اٹھے ہیں۔بجلی کی طرح ٹوٹ کر گریں گے۔وہ تو کہئے خیریت گزری۔شہر پہنچنے سے پہلے میری نظر پڑی تو حضور واللہ ہے یہ دیکھے کہ آندھی کی طرح اڑے آ رہے ہیں۔میں نے کہا انسان ہوں خس و خاشاک نہیں کہ تمہارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑا دیا جاؤں جیپنیا بیگم کا کیا ہے۔ایک دن نہ سہی اور بجلی کی سی تیزی سے یہاں پہنچا ہوں حضور، واللہ ہے کہ آپ کو خبر کر دوں۔

کسان-چمر گدھ

مجاور:۔ ہیں۔واللہ ہے یہ دیکھئے۔یہ وقت مذاق کا ہرگز نہیں۔مگر یہ دیکھئے یہ چمر گدھ آپ نے کسی کو کہا؟ چمر گدھ کہنے والے آپ کون؟ ہم بھی وہ بے نقط سنائیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے آپ کو۔مگر واللہ ہے یہ دیکھئے۔آپ ہیں کون ذات شریف؟

کسان:۔کسان ہن۔

مجاو:ر۔کسان آپ ہوا کریں۔ واللہ ہے لڑنے مرنے پر اُتر آئیں تو یہ دیکھئے ہم کسان وسان کچھ نہیں سمجھتے۔آپ نے ہمیں بھی کوئی اینچی فینچی سمجھ رکھا ہے واللہ۔ یہ کیا مذاق ہے؟ یوں گھور گھور کر کسے دیکھ رہے ہیں۔کیا کپڑے لے کر بھاگ گئے گا یا کھا جائیے گا کسی کو؟

مرزا صاحب:۔(جو کھیل میں مستغرق) کِشت۔

کسان:-گدھ-چمر گدھ (مجاور چلتے چلتے رُک کر غصہ سے کسان کو گھورتا ہے)

میر صاحب:۔ یہ سراسر نا انصافی ہے مرزا۔ یہ کھیل کا وقت ہرگز نہیں۔

مجاور:۔دریں چہ شک (شور بڑھتا ہے)

میر صاحب:۔(اُٹھتے ہوئے) زری دیکھوں مرزا، یہ کیا ہنگامہ ہے؟

مرزا صاحب:۔(ہاتھ پکڑ کر) اماں بیٹھے۔

کسان:۔چمر گدھ۔

مجاور:۔پھر وہی نا زیبا حرکت؟

کسان:۔ان کا ناس جائے پھرنگیں کا۔

مجاور:۔اچھا۔آپ فرنگیوں کو گالی دے رہے ہیں۔معاف کیجئے گا بڑی بھول ہوئی ہم سے۔مگر آپ نے بھی کچھ وضاحت سے کام لینا گوارا نہ کیا۔واللہ ہے بڑے ہی بد مذاق ہوتے ہیں یہ فرنگی۔آپ بھی انہیں کے بھگائے ہوئے ہیں۔

کسان:۔ہمرے پاس ہے کا جو لے بھگئیں؟

مجاور:۔بالکل درست پھر آپ کے یہاں تشریف لانے کی وجہ؟۔

کسان:۔ بال بچے سہر جات رہین۔ رستا ماں تنگ ستائے لاگن سوچن کہ ای پھرنگین کا تنک دیکھو لیہا۔

مجاور:۔واللہ ہے آپ کو یہ نہ سوجھی کہ آپ انھیں دیکھیں گے اور وہ آپ کو تناول فرما جائیں گے۔غالباً آپ اپنے دیہات شریف سے تشریف لا رہے ہیں۔

کسان:۔کھیتن کا ستیاناس ہوگوا ہے۔روند کے کارن چپرا کر دہن ساری فصل کا۔

مجاور:۔مشکل ہے آپ کے لئے ہماری بات کا سمجھنا اور واللہ ہے کہ آپ کی بات کا سمجھنا ہمارے لئے بھی غیر ممکن۔تو آیئے ہم لوگ خاموش ہو جائیں۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔کسان ایک کونے میں بیٹھا ہے۔مرزا صاحب کھیل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔میر صاحب بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور پھر کھیلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اٹھنا چاہتے ہیں، مگر اٹھ نہیں سکتے۔ مجاور ٹہلتا ہے اور بار بار باہر جھانک کر دیکھ لیتا ہے جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہو۔ مرزا صاحب اور میر صاحب کی طرف بڑھتا ہے، بات کرنے کے لئے منہ کھول کھول کر رہ جاتا ہے۔کسان کی طرف جاتا ہے مگر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے۔اتنے میں دھماکا ہوتا ہے اور میر صاحب ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے کود جاتے ہیں۔)

مجاور:۔آ گئے فرنگی حضور واللہ ہے۔

میر صاحب:ص۔(دروازہ کے پاس جا کر) زری دیکھیں۔

مرزا صاحب:۔اماں کہاں چلے میر صاحب بازی چھوڑ کر؟

میر صاحب:۔(دروازسے)حضت وہ تو سیدھے یہیں چلے آرہے ہیں،معلوم ہوتا ہے۔ (باہر نکل جاتے ہیں)

مرزا:۔کیوں خواہ مخواہ خطرے میں جان ڈالئے گا۔

مجاور:۔اے حضور واللہ یہ فرنگی بڑے ویسے ہوتے ہیں نام نہیں پوچھتے اور سیدھا بندوق سے داغ دیتے ہیں۔ چنے کے برابر گولی پڑے اور آدمی ٹائیں سے مرجائے۔ہم جائیں تماشا دیکھنے کیلئے اور الٹی آفتیں گلے پڑ جائیں۔

کسان:۔انکی پھرنگیں سسرن کی .... چمر گدھ

مرزا:۔(چپکے سے مہرے بدل کر) اچھی خاصی جمی جمائی بازی چھوڑ کر چل دیے۔

دیکھا کہ مات ہورہی ہے،بس

موقع مل گیا۔(میر صاحب گھبرائے ہوئے تیزی سے واپس آتے ہیں)

میر صاحب:۔انگریزی فوجیں آگئیں مرزا۔

مرزا صاحب:۔حضور یہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔آنے دیجئے۔یہاں وہ نہ آئیں گے۔ آپ یقین کیجئے(ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے)چلئے کِشت بچئے۔

مجاور:۔شہر پہنچیں گے تو یہ دیکھئے فخر و پہلون کے آگے سب چوکڑی بھول جائیں

گے واللہ۔

میر صاحب:۔اماں دیکھئے تو (پھر اٹھتے ہوئے) آڑ سے دیکھیں (آڑ سے دیکھتے ہیں) کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مجاور:۔دریں چہ شک

مرزا صاحب:۔(ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) دیکھ لیجئے گا۔کیا جلدی ہے۔پھر کشت (گنگناتے جاتے ہیں اور چٹکیاں بجاتے ہیں میر صاحب چال چل کر بار بار اپنی جگہ سے اٹھ جاتے ہیں) ؎ پیا پیارے اتنی عرج موری مان

مجاور:۔یہ دیکھئے حضور واللہ ہے۔

کسان:۔چمر گدھ

مجاور:۔بات کرنے کی تمیز نہیں آپ کو واللہ کسان صاحب۔

میر صاحب:۔توپ خانہ بھی ہے۔

مجاور:۔یہی تو بات ہے واللہ۔ورنہ ہم کیوں لوٹ آتے نامراد؟ وہ گھس پٹی بتاتے کہ وہ بھی یاد کرتے۔

میر صاحب:۔کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔

مجاور:۔اے حضور، ورنہ ٹھہر نہ جاتا بندہ درگاہ۔ایک دو ہزار کی حقیقت ہی کیا ہے۔ چٹکی میں پیس کر دکھ دوں پسوؤں کی طرح۔

میر صاحب:۔سرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مجاور:۔بندر ہی ہیں حضور، اور کیا؟

کسان:۔چمر کدھ۔

مجاور:۔آپ اپنی رائے نہ بدلیں گے واللہ۔

میر صاحب:۔زری، دیکھئے تو مرزا۔

مرزا صاحب:۔جناب حیلے نہ کیجئے۔یہ کشت۔

میر صاحب:۔آپ بھی عجیب آدمی ہیں ۔خیال تو کیجئے شہر کا محاصرہ ہو گیا تو گھر کیسے چلیں گے۔

رزا صاحب:۔جب گھر چلنے کا وقت آئے گا دیکھا جائے گا، یہ کشت اور مات (شور دور۔ہو گیا) (کسان چلا جاتا ہے)

مجاور:۔اے حضور واللہ ہے، سبحان اللہ ان ہاتھوں کے صدقے کیا اعجاز ہے۔

مرزا صاحب:۔آج کھانے کا کیا ہو گا (کسان اندر آجاتا ہے)

میر صاحب:۔آج روزہ ہے۔کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟

مرزا صاحب:۔جی نہیں۔شہر میں نہ معلوم کیا ہو رہا ہو گا؟

میر صاحب:۔شہر میں کچھ نہیں ہو رہا ہو گا۔لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے۔حضور جان عالم بھی استراحت فرما رہے ہوں گے یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو۔

مرزا صاحب:۔لیکن بھئی کھانا تو لازمی ہے۔صبح کے نکلے ہوئے ہیں۔اے میاں مجاور(مجاور دوسری طرف بڑھ جاتا ہے)

میر صاحب:۔اماں چھوڑیئے بھی کھانا وانا۔

مجاور:۔دریں چہ شک۔

میر صاحب:۔آیئے بس ایک بازی اور ہو جائے۔جیت کر کھیل ختم نہں کر دیتے۔ نہ یہ وضعداری کا تقاضہ ہے(مہرہ بڑھتے ہیں)

مرزا صاحب:۔(مہرہ بڑھتے ہوئے)اور جو جیت ہی آخیر تک نصیبوں میں لکھی ہو تو قیامت تک آپ نہ چھوڑیں گے۔

میر صاحب:۔یہ خوش فہمی اللہ،اللہ۔

مجاور:۔(کسان سے) آپ تو خیر کیا سمجھیں گے ہماری گفتگو اور بھلا ہمارے جذبات کا آپ کو کیا پاس۔آپ سے بات کیجئے تو خیر صلاّ کے ڈھیر لیجئے،مگر واللہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کسی انسان سے بات کریں۔دل کا حال کہیں۔انسان نہ سہی آپ سہی۔آپ کے سوا یہاں پر ہے کون؟اور اگر آپ بھی نہ ہوتے تو واللہ ہے کہ ہم دیواروں سے بات کرتے یا پھر اس ٹھہرے ہوئے پانی کی پرسکون موجوں سے جو آپ کو اس حوض میں نظر آرہا ہے یا ان بے حس مچھلیوں سے جو دم بھی نہیں مارتیں۔اکثر یہی مشغلہ رہتا ہے کہنا یہ کہ یہ دیکھئے قسمت کی یاوری اسے کہتے ہیں۔یہ دونوں حضرات جلیل القدر جو اسوقت آپ کے سامنے مرغ زرّیں کی طرح

سجے بیٹھے ہیں۔اگر شطرنج کی بازی ان دونوں صاحبان کو آدمی سے الّو نہ بنادے تو آج ہم کھانا لینے کے لئے ضرور بھیجے جاتے اور شہر کے بازاروں میں ذبح کر کے پھینک دئے جاتے اور مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہوتے۔خدائے تعالیٰ جس کی ذات والا تبار سے کوئی امر بعید نہیں، ان کی بھوک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔آمین ثم آمین۔

میر صاحب:۔کشت۔

مرزا صاحب:۔اے میر صاحب، واللہ مارے بھوک کے انتڑیاں قل ہواللہ پڑھ رہی ہیں۔اے میاں۔اے میاں مجاور۔ذرا سننا بھی ادھر آؤ۔

مجاور:۔حضور۔

مرزا صاحب:۔زدی ادھر آیئے(مجاور آتا ہے)زری لپک کرندی پار چلے جاؤ۔علی بخش کی گلی سے ہو کر اللہ دین درزی کی دوکان پر پہنچو گے تو اسکے سامنے نکڑ پر ایک نانبائی کی دوکان ہے۔وہاں سے کچھ تافتان اور کباب لیتے آنا۔

مجاور۔(تھرتھراتا ہے گھگھی بندھ جاتی ہے)ح،ح،ح،حضور واللہ یہ خادم آپ پر قربان ہے یہ دیکھئے مجھے نہ بھیجئے۔

مرزا صاحب:۔کیوں؟

مجاور:۔جان آپ کے لئے حاضر پیرو مرشد،مگر للہ مجھے شہر نہ بھیجئے۔بہت خون

خرابا ہوگا سرکار۔ بن موت مر جاؤں گا۔ یہ کسان کمبخت آخر کس مرض کی دوا ہے۔
واللہ ہے میری جان اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ دیکھئے اسے بھیج دیجئے۔

مرزا صاحب:۔ میاں سید امیر علی شہید کی درگاہ کے مجاور ہو اور اس قدر بز دل؟

میر صاحب:۔ اس غریب کی جان پر بن آئی ہے اور آپ کو کھانے کی سوجھ رہی ہے۔

مجاور:۔ حضور فرنگیوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مولوی صاحب کو جہاد سے نہ روکا گیا تو سلطنت چھین لی جائے گی۔ واللہ ہے چو ہے چو ہے۔ کو معلوم ہے کہ سلطنت چھیننے کے لئے آئے ہیں اور یہ دیکھئے شہر والے ضرور لڑیں گے اور بہت کشت و خون ہوگا۔ بندۂ درگاہ کتے کی موت کوچہ و بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں مرنا چاہتا، بندۂ پرور مجھے بخش دیجئے......اے میاں کسان، ز دی سننا۔

مرزا:۔ جاتے ہو یا اپنے ہاتھوں تمھارا کام تمام کر دوں؟

مجاور:۔ ملائی بھی لیتا آؤں حضور۔

مرزا:۔ ہاں افیون بھی لیتے آنا چھٹا نک بھر۔ بلکہ وہیں کھا کر سو رہنا۔ نامعقول۔

(مجاور بہت بے دلی سے قدم گھسیٹتے ہوئے باہر جاتا ہے)

میر صاحب:۔ (مہرہ اٹھا کر گنگناتے ہیں) میں تو شہزادے کو ڈھونڈن چلیاں
انگ بھبھوت جوگن بن ملیاں

چھان پھریں سب گلیاں ۔

میں تو شہزادے کو ڈھونڈن چلیاں

(انجان سے فرزیں اُٹھا لیتے ہیں)

مرزا صاحب: ۔فرزیں کیسے پیٹ لیا۔ رکھئے رکھئے۔ بتایئے کیوں کر پیٹ لیا فرزیں۔؟

میر صاحب:۔ اے...... یہ دیکھئے۔

مرزا صاحب:۔اچھا تو خیر یہی سہی۔آپ زری اتنی عجلت نہ دکھایا کیجئے حضت لیجئے رخ مار لیا۔

(مجاور دبے پاؤں واپس آتا ہے اور نظر بچا کر ایک کونے میں دبکنا ہی چاہتا ہے کہ مرزا کی نظر اس پر پڑتی ہے)

مرزا صاحب:۔(مجاور کو دیکھ کر) اماں تم لوٹ آئے؟

مجاور:۔شہر تو نظر ہی نہیں آتا حضور، واللہ ہے کوئی جائے تو کیسے جائے اور کدھر جائے۔یہ دور دور تک فرنگی ہی فرنگی نظر آتے ہیں۔واللہ ہے اگر کوئی بتا دے کہ شہر مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف تو ٹانگ کی راہ سے نکل جاؤں۔

مرزا:۔(اس کی طرف لپکتے ہیں کہ گردن ناپیں) کمبخت سیدھی طرح جاتا ہے یا ....

مجاور:۔حضور واللہ ہے کہ ہم دھمکیوں میں آنے ولے آدمی نہیں، مگر یہ دیکھئے حضور کی حکم عدولی کرنا ہمیں ہرگز نہیں آتا (چلا جاتا ہے۔میر صاحب اسی اثنا میں بساط پر ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں)

مرزا:۔(پکارتے ہوئے) کتے کی چال جانا اور بلی کی چال آنا اور سمجھ لو خیریت نہیں ہے۔خدائی خوار گدھے سوار۔ میر صاحب۔بس اب کشت بچئے۔مرزا (کھڑے ہوجاتے ہیں) سب راہیں نجات کی مسدود ہیں۔کوئی چال نہیں۔بات سمجھئے۔ ویسے جی چاہے تو دو ایک خانوں میں گھوم پھر کر دیکھ لیجئے۔مگر کیا کیجیے گا۔زحمت ہوگی (اس آخری تقریر کے دوران میں مجاور دبے پاؤں واپس آجاتا ہے اور اپنے کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے)

مرزا:۔یعنی یہ کہ ہم کو مات ہوگئی۔

میر صاحب:۔جی! کھانا نہیں کھایئے گا؟

مرزا:۔کھانے کی ایسی تیسی۔اب کی آجایئے۔

میر صاحب:۔ہارنے والے کی باتیں

مرزا:۔دو بازیاں ہار چکے ہیں۔ایک کیا ہرا دیا گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی۔

میر صاحب:۔ہفت اقلیم کی بادشاہت کو جوتی کی نوک پر مارتے ہیں، مگر آپ کو تو بہت بھوک لگی تھی۔

مرزا صاحب:۔اجی آتو جائے کھانا۔چلئے۔

میر صاحب:۔ (گاتے ہیں) موری انکھیاں پھرکن لاگین

کہاں گیو یار کدھر گئیں سکھیاں

انکھیاں پھرکن لاگیں

دیہہ پھکت ہے جیا ترپت ہے

پیت لگا کر مزا ہم چکھیاں

انکھیاں پھرکن لاگین

مجاور:۔ واہ واہ۔

مرزا:۔ (چونک کر) میاں تم قطب بن گئے ملنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ابھی تک یہیں ہو۔

مجاور:۔ آپ کو کھانے سے سروکار ہے حضور، میری جان سے تو غرض نہیں، واللہ ہے کھانا آرہا ہے۔

مرزا:۔ اُس کمبخت بڈھے کو بھیج دیا تم نے؟

مجاور:۔ خداوند میں نے ہرگز نہیں بھیجا ہے واللہ۔ وہ کمبخت بڑھا خود اپنی جان سے بیزار نظر آتا تھا۔ شہر جانے پر کمر باندھے ہوئے تھا۔ یہ دیکھئے کہتا تھا فرنگیوں کو قریب سے دیکھوں گا۔

مرزا:۔ اس جانگلو کو بھلا کیا پرکھ کھانے کی۔ شہر کے راستوں تک سے تو آگاہ نہ

ہوگا۔

مجاور:۔ یہ دیکھئے راستوں سے خوب آگاہ ہوگا حضور واللہ ہے رات دن دیہات اور شہر ایک کردئے ہونگے۔ صبح سے شام تک اسے پیدل چلنے کی سزا ہے اور رہی کھانے کی پرکھ، تو واللہ ہے چہرہ سے مردود ذہین معلوم ہوتا ہے

میر صاحب۔ چھوڑیے مرزا اس فرعون بے سامان کو، زری غور کیجئے بازی پر۔ ٹوٹ گیا آپ کا قلعہ، بادشاہ سلامت پر رخ کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اسکی خیر منایئے۔

مرزا:۔ کمال کرتے ہیں آپ۔ یعنی بازی شروع نہیں ہوئی اور بادشاہ کی خیر منانے لگے۔

میر صاحب:۔ کشت۔

مجاور:۔ اے سبحان اللہ، کیا نقشہ ہے۔

مرزا صاحب۔ لیجئے۔

مجاور:۔ شاباش حضور آفریں۔

میر صاحب:۔ کشت۔

مجاور:۔ صدقے جاؤں، کیا خوبصورت، کیسی حسین کشت ہے۔

مرزا:۔ اچھا تو یہ سہی۔

مجاور-:۔ میاں 'ہاں، یہی سہی۔

میر صاحب:۔ فیل شہید ہوا۔ اور پھر کشت۔

مجاور:۔اے حضور واللہ ہے، یہ دیکھئے واہ واہ۔

مرزا:۔یہ کشت بچیئے۔

مجاور:۔اچھا! بہت خوب بہت خوب۔

میر صاحب:۔وہ رخ کا گھر ہے۔آنکھیں کھول کر بڑھئے۔

مجاور:۔جی۔

مرزا صاحب:۔یہ سہی۔

مجاور:۔اب بولئے۔

میر صاحب۔یہ پیدل سے ایک بار پھر کشت۔

مجاور:۔وہ مارا۔شاباش ہے حضور، واللہ جواب نہیں ہے دنیا فانی میں آپ کا (کھیل کی تیزی دیکھ کر قریب کھسک آیا ہے۔اور گھوم گھوم کر آنکھیں گھما گھما کر کھیل دیکھتا ہے۔)

مرزا:۔اچھا یہ ہے۔

مجاور:۔واللہ ہے یہ دیکھئے خوب ہٹے۔

میر صاب۔تو لیجئے، یہ کشت اور تین چالوں میں مات۔دیکھ لو بس مات!

مجاور:۔اے سبحان اللہ، اے سبحان اللہ، اے سبحان اللہ، قربان جاؤں حضور واللہ ہے کیا کہنے ہیں (مرزا کچھ دیر سوچنے کے بعد بازی اُلٹ دیتے۔میر صاحب اٹھ جاتے ہیں مگر مرزا جلدی جلدی پھر سے مہرے سجاتے ہیں۔)

میر صاحب:۔ یہ بڈھا مردود نہیں آیا اب تک کھانا لے کر؟

مرزا صاحب:۔ مارا گیا ہوگا۔

مجاور:۔ واللہ ہے اپنی جان عزیز کی قسم ضرور مارا گیا ہوگا، لاحول ولا۔ میرا مطلب ہے حضور کی جان عزیز کی سوگند ہے کہ بڈھا ہرگز جیتا نہ ہوگا۔

مرزا صاحب:۔ (مہرے بچھا کر) کہاں چلے ہیں حضت آئے یہ شطرنج کی بازی ہے مذاق نہیں ہے۔ یوں ختم نہیں ہوتی۔

مجاور:۔ بے شک

میر صاحب:۔ گنتے جایئے، دوسری بات تھی۔

مرزا صاحب:۔ اخیر میں گن لیجئے گا اگر ہوش ٹھکانے رہ گئے۔ (کسان کھانا لیکر واپس آتا ہے)

میر صاحب: ۔اے میاں کھانا لے آئے؟

کسان:۔ لے ہتن کا ہے ناجور (کھانا پاس لاکر رکھ دیتا ہے مرزا صاحب خاموشی سے ایک طرف ہٹا دیتے ہیں)

میر صاحب:۔ کھانا نہیں کھایئے گا۔

مرزا صاحب:۔ اجی کھالیں گے۔ جلدی کیا ہے۔ آ جایئے۔

(دونوں کھیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مجاور ایک کونے میں جا کر اشارے سے

کسان کو بلاتا ہے)

مجاور:۔لائے ہماری چیز؟

کسان:۔ہاں ان، وہو لائن (ٹینٹ سے نکال کر کاغذ کی ایک پڑیا دیتا ہے۔)

مجاور:۔واللہ ہے جیو(خوشی خوشی افیم کی پڑیا کھول کر گولی منہ میں رکھ لیتا ہے) کیا حال ہے لکھنؤ کا؟

کسان:۔بھگدر مچی ہے چاروں اور، پھرنگین سارن کا سبھے گریاوت رہیں۔بس اس لاگے کہ ترنتے گدر مچ جیہئے۔

مجاور:۔یہ دیکھئے شوق کیجئے گا؟

کسان:۔کا؟

مجاور:۔کھاؤ گے؟

کسان:۔ناہیں سرکار......بس آپے......

مجاور:۔دیکھ لیا فرنگی کو اچھی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر؟

کسان:۔دیکھ لیا۔چمر گدھ۔

مجاور:۔خیر مناؤ تم بچ آئے۔

کسان:۔نکھلو گوا جور، بس نکھلو گوا۔جور، دوہُو دن رہیں جب یہاں بڑے بڑے راجا باشاہ راج کرتے رہیں۔۔ہے ناجور؟

مجاور۔بات تو پتے کی کہتے ہو واللہ۔

کسان:۔ وہی چھائے بچھائے رہیں پورے ملک ماں۔ دیس بھر ماں انھیں کا جھورا رہے سرکار۔

مجاور:۔ بے شک۔ بے شک۔

کسان:۔ اور اب کا رہ گوا ہے جچو ر، ایہی گھند ہر دیکھ لیو۔

مجاور:۔ واللہ ہے بس۔ اب یہ کھنڈر رہ گیا ہے بے شک

کسان:۔ کال اے ہی مہجد سان بڑھاوت رہے آج کبرستان بن گئی۔

مجاور:۔ ہمارے دل کی بات کہہ دی یار تم نے۔ شاباش۔ واللہ ہے آپ کے دماغ کے ہم بھی قائل ہو گئے آج۔ اول تو آپ نے یہ جوانمردی دکھائی کہ موت کے منہ میں سے ہمارے لئے چنیا بیگم کو کھینچ لائے اور پھر آپ کی یہ گلفشانیاں۔ اللہ اللہ۔

کسان:۔ اب ایہہ کا مہجد نہ جانو۔ پھوٹا دیا جانو۔ ہے نا ہجور؟

(مجاور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے)

مرزا:۔ اے میاں کیا ہوا؟ رو کیوں پڑے عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر؟

مجاور:۔ یہ دیکھئے یہ مسجد کبھی ہماری شان تھی۔ اب قبرستان بن گئی ہے۔ واللہ اب یہ ایک ٹوٹا ہوا دیا ہے حضور۔

میر صاحب:۔ نشے میں بک رہا ہے۔ آپ کسی سڑی کی باتوں پر دھیان دیتے ہیں۔ کشت بچیئے۔

مجاور:۔ یہ ویرانہ اب اور ویران ہو گا اللہ۔ بہت بڑا بھونچال آ رہا ہے، بہت تیز آند

ھی آ رہی ہے۔اے حضور دیکھئے گا کھنڈر کا پتھر پتھر ہلنے لگا ہے۔واللہ ہے یہ دیکھئے، یہ ویرانہ اب اور ویران ہو جائیگا ،اب تھوڑی دیر میں واللہ اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔اے دیکھئے حضور، وہ چھت گری۔

(باہر بھاگ جاتا ہے)

میر صاحب:۔ پاگلوں کی بڑ سننے میں نہ جانے آپ کو کیا لطف آتا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا وہ نشے میں ہے۔ چلئے کشت بچیئے۔

کسان:۔ بہتے چڑھ گئی سرکار۔

مرزا صاحب۔آپ سے کس نے دریافت کیا تھا؟ دخل در مقولات! ان کمبختوں کی باتوں نے آج ہمیں بہت بہکایا۔

میر صاحب:۔توجہ کیجئے حضت۔

مرزا صاحب:۔توجہ کیا خاک کریں (باہر کھٹکا ہوتا ہے۔مرزا جانا چاہتے ہیں) لڑائی چھڑ گئی میر صاحب۔

میر صاحب:۔اماں بیٹھے چین سے، چھڑنے دیجئے لڑائی۔آپ کا بادشاہ معزول ہوا چاہتا ہے۔

مرزا:۔ یہ شور کاہے کا ہوگا؟ (دونوں کان لگا کر سنتے ہیں۔اسٹیج پر مجاور کا راجہ اِندر کا سا داخلہ، دونوں کو دنگ کر دیتا ہے۔مجاور نشہ میں چور ہے)

مجاور۔سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے۔

پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

میر صاحب:۔(مہرہ بڑھتے ہوئے)اے سبحان اللہ- پری جمالوں کے افسر کا حلیہ شریف زری ملاحظہ کیجئے۔

مجاور:۔فرنگی نے منہ کی کھائی۔انگریزی فوج کو پسپائی ہوئی۔

مرزا صاحب:۔(مجاور سے) یہ کیا ناٹک ہے میاں؟ بکواس بند کرد۔

مجاور۔جھوٹے پر تین حرف جہاں پناہ کا نمک کھایا ہے واللہ۔جھوٹ کہوں تو ابھی سر قلم کر دیا جائے اسی وقت! فرنگی کو شکست ہوئی ضرور بالضرور۔نہ ہوئی ہوتو جو چور کی سزا وہ ہماری۔

میر صاحب:۔ہاں ہاں میاں، فرنگیوں کو شکست ہوئی۔وہ کیسے؟

مجاور:۔واللہ ہے یہ دیکھئے، ابھی شہر کی طرف بندۂ درگاہ کا گذران ہوا، سوچا کہ ذری معلوم تو کرلوں قیصر باغ میں کیا ہو رہا ہے۔

میر صاحب:۔پھر؟

مجاور:۔دیکھتا کیا ہوں شہر میں فرنگی فوج کا چوطرفہ محاصرہ تھا۔فدوی نے ایک زور کی پھونک لگائی تو واللہ ہے یہ دیکھئے دو چار سپاہی صاف ہوا میں اُڑ گئے (میر صاحب قہقہہ لگاتے ہیں) بچتا بچاتا شہر میں پہنچا اور سیدھا قیصر باغ گیا۔اندر جا کر ایک دروازے کی دراز سے جھانک کر کیا دیکھتا ہوں واللہ ہے یہ دیکھئے کہ حضور جان عالم

اختر پیا اپنی محبوب خاص یعنی جعفری بیگم کے ساتھ تخلیہ میں!

میر صاحب:۔ ہائے۔

مرزا:۔ بیہودہ!

کسان- چمر گدھ-

مجاور:۔ اور جعفر بیگم لیٹے ہی لیٹے ہلکے سروں میں برج کی دھن میں امانت کی ٹھمری گا رہی تھیں۔

سدھ لاگی رہی توری آٹھ پہر
تن من کی نہیں موہے خاک خبر

میر صاحب:۔ اہاہا۔ کیا ٹھمری ہے واللہ (مجاور کچھ ذرا سا گاتا ہے، کچھ میر صاحب بھی گلا ملاتے ہیں) واہ واہ۔

مجاور:۔ یہ دیکھئے پیا پیارے اشارے اشارے میں نئی نئی مرکیاں سکھا رہے ہیں۔ اتنے میں یہ دیکھئے دستک ہوئی۔ حضور جان عالم چونک پڑے جب معلوم ہوا کہ فرنگیوں کی حراست میں ہیں تو رو پڑے۔

میر صاحب:۔ ہائے۔ واللہ۔

مجاور:۔ اگر کوئی جھوٹ ثابت کر دے تو بے فصل کے آم کھلاؤں۔ کہنے لگے غسل تو کر لینے دو۔ اتنے میں مصاحبین اور امراء جمع ہو گئے تسلی تشفی دی اور کہا، حضور اُداس نہ ہوں۔

میر صاحب:۔اداس؟ نصیب دشمناں۔!

مجاور:۔ بندۂ درگاہ بھی وزراءاور رؤسا کی صفوں کو چیرتا ہوا اندر پہنچا اور آگے بڑھ کر نسخہ تجویز کیا۔اور ساتھ ہی ترکیب استعمال بھی اور واللہ ہے نسخہ وہ کارگر ہوا کہ یہ دیکھئے کہ فرنگیوں کے اچھے خاں بھی یاد کریں گے۔

میر صاحب:۔(مہرہ بڑھتے ہوئے) وہ کونسا نسخہ؟ ذری ہم بھی سنیں بھئی۔ چال چلئے مرزا۔

مجاو:ر۔میں نے دست بستہ خدمت اقدس میں عرض کیا،اے حضور میری جان صدقے ،واللہ آپ کی پاپوش مبارک کیوں غم کرے،ہم لوگ موجود ہیں تو پھر یہ دیکھئے آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

بے شک بے شک!

میر صاحب:۔ بے شک کشت۔ پھر کیا فرمانے لگے؟

مجاور:۔میری بات سنکر واللہ ہے، یہ دیکھئے اور رونے لگے۔ میں نے کہا اے حضور نصیب دشمناں ہمارے ہوتے ہوئے آخر سبب اس گریہ وزاری کا ؟ (روتے ہوئے) تو پھر کیا شہسوار بھیجو گے؟ (دبنگ لہجے میں) اے حضور واللہ ہے شہسواروں کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دیکھئے خواہ خواہ گھوڑوں کے سُم گھسیں گے،دھول اڑے گی۔شرفا کے کپڑے میلے ہو جائیں گے۔

میر صاحب:۔اے واہ، واری جاؤں۔ کیا دور کی سوجھی۔ دھول تو اڑے ہی گی،

کشت بجیے حضور۔

مجاور:۔(روکر) تو پھر کیا توپ خانہ بھیجو گے۔(جواباً) حضور توپ خانہ کیوں بھیجا جائے؟ واللہ ہے دھنا دھن سے بچوں کے کلیجے دہل جائیں گے۔ ناحق سمع خراشی ہوگی ۔اگر حضور جان عالم اجازت دیں تو یہ دیکھئے،شہر کی مہترانیوں کو لمبے لمبے بانس دیدئے جائیں اور حکم دیا جائے کہ مار کر ان بندروں کو بھگائیں (کسان ہنستا ہے)

میر صاحب:۔واہ واہ مرحبا کیا ترکیب نکالی ہے واللہ۔خدا نظر بد سے بچائے،ان کو تو سلطنت اودھ کا سپہ سالار ہونا چاہئے تھا۔بھئی کشت بجیے مرزا۔

مجاور:۔مصاحبین کہنے لگے، یہ کیسے ہوسکتا ہے،مہترانیوں میں بہت سی بیگمیں بھی ہیں۔اگر جان کی اماں پاؤں تو ایک عرض خدمت عالی میں پیش کروں۔

میر صاحب:۔ضرور ضرور، بھئی تمھیں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟

مجاو:ر۔جی نہیں، میرا مطلب ہے میں نے وزراء اور مصاحبین کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا،اے حضور اگر جان کی اماں پاؤں تو خدمت عالی میں ایک عرض پیش کروں۔

میر صاحب:۔کون سی عرض؟

مجاور:۔اے حضور مہترانیوں کو بھی تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے واللہ؟ اے حضور قبلہ و کعبہ، جوں ہی نگوڑے گورے محل کی طرف آئیں چقیں ڈلوا دیجئے۔

قناطیں کھچوادیجئے اور کہدیا جائے کہ یہاں پردہ ہے۔ یہ دیکھئے اب ایسے بھی بے حیا نہیں فرنگی، جو کسی کے زنان خانے میں گھس آئینگے۔ کیجئے یہی۔ ہو جائے گی شہر کی مکمل حفاظت۔ آداب عرض ہے۔

میر صاحب:۔ واہ واہ کیا افلاطونی دماغ پایا ہے ماشااللہ! (مرزا سے) اے حضت واللہ یہ ان احمق فرنگیوں کو کوئی سمجھاتا کیوں نہیں۔ بیٹھے بٹھائے موت کے منہ میں چلے آتے ہیں۔ کیوں مرزا؟

مرزا صاحب:۔ جی ہاں

مجاور:۔ مجھ کو ایذا ہوئی پاپوش کے صدقے سے ہوئی

جان اللہ نے گلفام بچائی تیری

مرزا:۔ جانے میر صاحب۔ کشت بچئے مرزا۔

مجاور:۔ ہو چکے عشق میں بدنام بڑی مدت تک

اب زمانے میں ہمیں نام مبارک ہوئے

میر صاحب:۔ اب زمانے میں ہمیں نام مبارک ہووے۔ سبحان اللہ!

مرز صاحب:۔ گھر کا کیا حال ہوگا میر صاحب۔

میر صاحب:۔ چھوڑئے گھر کا خیال۔

مرزا صاحب:۔ واجد علی شاہ کا حرم ماتم کدہ بنا ہوگا اس وقت۔

میر صاحب:۔ جی ہاں۔ چلئے (باہر شور ہوتا ہے۔ کسان لپک کر دروازے

پر پہنچ جاتا ہے) کسان ۔ چمر گدھ۔ ان کا ناس جائے۔ گوانکھلوٴ ۔ ان کا پھرنگی ماروں (باہر جاتا ہے)

مرزا صاحب:۔انگریزی فوجیں یہیں آ رہی ہیں شاید، میر صاحب۔

میر صاحب:۔آنے دیجئے۔

مرزا صاحب:۔زری دیکھئے تو،حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے؟

میر صاحب:۔ہوگا۔آپ کوئی قاضی ہیں؟ یہ کشت بچیئے۔

مرزا صاحب:۔حضت ذرا ٹھہریئے گا۔اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔حضور عالی خون کے آنسو روتے ہونگے۔لکھنو کا چراغ آج گل ہو گیا۔

میر صاحب: ۔رویا ہی چاہیئے۔یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔یہ کشت۔

مرزا صاحب:۔کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں رہتے۔بلائے آسمانی ہے۔

میر صاحب:۔ہاں ہے ہی۔پھر کشت۔بس دوسری کشت میں بات ہے۔بچ نہیں سکتے۔

مرزا صاحب:-آپ بڑے بے درد ہیں واللہ۔ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ہائے حضور جان عالم کے بعد اب کوئی کمال کا قدر داں نہ رہا۔لکھنوٴ ویران ہو گیا۔

مجاور صاحب۔ واجد علی پیارا کلکتے کو سدھارا۔سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گئی ہے۔ہائے

لکھنؤ وائے لکھنو! اندر سبھا کا اختر نگر لٹ گیا۔ امانت کے لکھنؤ کا سہاگ اجڑ گیا (روتا ہے) ہائے امانت حضور واللہ ہے کہیں امانت اس معرکہ میں نہ مارے گئے ہوں۔ یہ دیکھئے غضب ہو جائے گا ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے! اور نہ جانے سبز پری کا کیا ہوگا حضور! واللہ ہے یہ دیکھئے

پری سبز ہے جو اکھاڑے میں یاں
اسی کا ہوں دیوانہ میں نیم جاں

مرزا صاحب:۔اے تاج برطانیہ کے جان نثار شہید! اے لارڈ ڈلہوزی کے خنجر کے وفادار بسمل ! اے لٹے ہوئے قافلے کے قافلہ سالار ! ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہیں۔

میر صاحب :۔پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچایئے، پھر حضور پرنور کا ماتم کیجئے گا۔ یہ کشت اور مات لانا ہاتھ۔ پیدل سے مات ہوئی ہے مرزا یاد رکھنا۔

کسان :۔(واپس آ کر) اکھتر پیا پھرنگین ساتھ اس جھر جھر آنسو بہاوت جات رہیں۔جس کو دولھنیا سسرال جات ہووے۔

رانی مہارانیو ردت پیٹیت رہیں سب سورما سسر ٹکر ٹکر دیکھا کیہن نہ جانے ای پھوج سسر کا ہے بھرتی بھئی رہے۔کاٹ کے پھینک دیکا رہے پھرنگین کا۔

میر صاحب:۔آیئے اب کچھ کھالیں۔

مرزا صاحب:۔اماں بازی چھوڑ کر کھانا کھالیں کمال کرتے ہو۔

میر صاحب:۔ذری دم تو لے لیجئے۔

مرزا صاحب:۔اماں آیئے بھی۔

میر صاحب:۔شام ہو رہی ہے مرزا۔

مرزا صاحب:۔ہونے دیجئے۔رات رات بھر نہیں کھیلی ہے شطرنج آپ نے؟

میر صاحب:۔آیئے تو نواب صاحب کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔

مرزا صاحب:۔کہہ لیجئے گا۔چلئے۔

میر صاحب:۔حضرت معلوم ہے آپ بڑے شطرنج باز کی دم ہیں۔متواتر تین ماتیں کھا چکے ہیں۔اب پہلے کھانا کھایا جائے گا پھر کوئی اور بات ہوگی (بڑھ کر کھانا لے آتے ہیں)

مرزا صاحب:۔کمبخت ٹھنڈا کھانا لے کر آیا ہے۔(یہ کہہ کر کھانا پھینک دیتے ہیں۔اور بساط جماتے ہیں کھیل پھر شروع ہو جاتا ہے)

میر صاحب:۔یہ آپ نے کیا ستم کیا؟اب کیا خاک کھایئے گا۔

مرزا:۔جی ہاں۔خاک کھانا ہی نصیب میں ہے۔

میر صاحب:۔کمال کرتے ہیں۔ہارنے لگے تو آپے سے باہر ہو گئے۔

مجاور:۔سبز پری۔ہائے سبز پری (کسان سے) تم نے کہیں دیکھا ہے سبز پری کو۔

کسان:۔ پری۔

مجاور:۔ ہاں ہاں سبز پری میری سبز پری ۔ شہزادہ ہوں ہند کا نام میرا گل فام۔

میر صاحب:۔ اے کیا کہنے ہیں گل فام کے۔

مرزا صاحب:۔ آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے ہیں، مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجئے، جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجئے۔

مجاور:۔ اے حضور واللہ ہے، یہ فرنگی سبزی پری کے ساتھ کیا سلوک کریں گے آپ کچھ بتا سکتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔ آپ چال واپس نہ لیا کیجئے حضت۔ یہ کیا چال چلی اور فورا واپس لے لی۔ جو کچھ ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجئے۔

مجاور:۔ اے ٹوٹی ہوئی مسجد کی محرابو! اے حوض کی پرسکون موجوں اے بے حس مچھلیو! بتاؤ میری سبز پری کہاں ہے۔

مرزا صاحب:۔ حضت آپ ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں اس کی حد نہیں۔ جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں گے اس کی مات سمجھی جائے گی۔

مجاور:۔ سبز پری فرنگی کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کرے گی۔ مگر واللہ ہے یہ دیکھئے اب سبز پری کبھی ناٹک میں حصہ نہیں لے گی۔ بس اب فرنگی کے گھر ہی میں اندر سبھا

ہوگی اور رہس ہوگا۔

مرزا صاحب:۔پھر آپ نے چال بدلی۔مہرہ وہیں رکھ دیجئے۔

میر صاحب:۔میں نے چال چلی کب تھی۔

مرزا صاحب:۔آپ کی چال ہو چکی ہے خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اس گھر میں رکھ دیجئے۔

میر صاحب:۔اس گھر میں کیوں رکھدوں؟ میں نے مہرے کو چھوا کب تھا؟

مرزا صاحب:۔آپ قیامت تک مہرہ کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر صاحب:۔ دھاندلی کرتے ہیں آپ! ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتتا۔

مرزا صاحب:۔بس یہ بازی آپ کو مات ہوگئی۔

میر صاحب:۔مجھے مات کیوں ہونے لگی؟

مرزا صاحب؛-تو آپ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر صاحب:۔وہاں کیوں رکھوں؟ نہیں رکھتا۔

مرزا صاحب:۔آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر صاحب:۔ہرگز نہیں۔

مرزا صاحب :رکھیں گے تو آپ کے فرشتے خاں بھی۔آپ کی حقیقت ہی کیا

ہے۔اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلی ہوتی تو آ ئین اور قوانین سے واقف ہوتے ۔ وہ تو ہمیشہ گھاس چھیلا کئے ۔آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جا گیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر صاحب: ۔گھاس تو آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے ۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گزر گئیں ۔

مرزا: ۔اجی جائے۔نواب غازی الدین کے ہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گزر گئی۔اس کے طفیل جا گیر پا گئے آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے۔رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر صاحب: ۔کیوں اپنے بزرگوں کے منہ پر کالک لگا رہے ہو؟ وہی باورچی رہے ہونگے ۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ہم نوالہ وہم پیالہ تھے۔

مرزا صاحب: ۔شاہی دسترخوان کے ٹکڑ گدے اب ہم نوالہ وہم پیالہ کہلائیں گے۔ بے حیاؤں کو شرم نہیں آتی ۔

میر صاحب: ۔لام کاف نہ بکئے ذری۔ زبان سنبھالئے ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں ۔تلوار ہمیشہ میان سے دو اُنگل باہر رہتی ہے۔کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ بھنڈارکھل گیا۔

مرزا صاحب:۔آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے؟ تو سنبھل جایئے۔اچھے خاں یاد آجائیں۔تقدیر آزمائی ہوجائے آج یا اِدھر یا اُدھر (تلوار کھینچ لیتے ہیں)

میر صاحب:۔ہاں آجاؤ۔تم سے دبتا کون ہے (تلوار کھینچ کر) یا علی

مرزا صاحب:۔(وار کرتے ہوئے) یا مرتضیٰ علی (دونوں لڑتے ہیں۔بیچ بیچ میں وار روک کر کہتے جاتے ہیں)

میر صاحب:۔خاندان کی ناک رکھنا مرزا۔

مرزا صاحب:۔سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری۔

میر صاحب:۔زری سنبھلے رہیئے۔

مرزا صاحب:۔آپ اپنی خیر منائیے قبلہ!

میر صاحب:۔ذوالفقار ایک کیا سیکڑوں کو ایک ہی وقت میں فنا کردے۔یا علی مشکل کشا۔

مرزا صاحب:- یا علی مدد دے۔مرتضیٰ علی مدد دے (دونوں نے پینترے بدلے۔لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے،تلواریں چمکیں چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے اور وہیں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔لڑائی چھڑتے ہی مجاور کا نشہ ہرن ہوگیا۔پہلے تو وہ اپنے گوشے میں جا کہ آنکھ بند کئے بیٹھا رہا۔پھر تلواروں کی جھنکار کی تاب نہ لا سکا۔اور آنکھ کھول کر اٹھا اور دبے پاؤں بچتے بچاتے باہر نکل گیا۔کسان جہاں تھا۔وہیں اطمینان سے جما رہا۔اور بہ نگاہ عبرت یہ منظر دیکھتا رہا۔جب دونوں کا خاتمہ ہوگیا تو مجاور نے جھانک کر دیکھا۔اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اندر آیا۔پہلے تو لاشوں کا جائزہ لیا،پھر کسان سے یوں مخاطب ہوا)۔

مجاور:۔ در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں

رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کسان:۔ آج دیکھ لیہا ہم ہو شطرنج کے اُپرّ جھگڑا۔ اُس لڑے مجس کو وَو مہرا رو کے اُپر کٹ مرا ہوئے باسا ہ جو رکی کھاتر کھون تو کھون کونو کی پلکن سے ایک بوند نپیو نہ ٹپکا۔

مجاور۔ عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہوئے۔

اس زمانے میں ہمیں نام مبارک ہوئے

کسان۔ سسرن کا ناس جائے۔ دھرتی بھسم کرے ان کا ناس جائے۔ (بڑ بڑاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

(رات ہو گئی ہے چاند کی روشنی ٹوٹی ہوئی دیوار اور چھت سے چھن چھن کر اندر آ رہی ہے۔ مجاور اٹھ کر شمع روشن کرتا ہے اور اپنے گوشہ میں اسی انداز اور اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے، جیسے کھیل کی ابتدا میں بیٹھا ہوا تھا اور اسی درد انگیز آواز سے جس سے ابتداء میں انشاء کی غزل گائی تھی

غالب کی یہ غزل بہت حسین دھن میں پڑھتا ہے۔ آخری شعر پر آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل　　زنہار اگر تمھیں ہوس ناو نوش ہے